ستمبر ۱۹۷۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مرتب
شیخ جمیل الرحمٰن

جلد ۲۷	ستمبر ، اکتوبر ۱۹۷۸ء	شمارہ ۹-۱۰

- تذکرہ و تبصرہ — — — — — ڈاکٹر اسرار احمد صفحہ ١
- صراط مستقیم (اشری تقاریر) — — — ,, ,, ,, ,, ٩
- معاشرتی بہبود کے لئے وسائل — — — ,, ,, ,, ,, [illegible]
- چند جدید طبی مسائل اور فقہ اسلامی — مولانا وصی مظہر ندوی ,, [illegible]
- مسئلہ تناسخ کی تحقیق — — — — — غازی عزیز صاحب (علی گڑھ - بھارت) ,, [illegible]
- تصوف ، تحقیق و تجزیہ — — — — — حکیم نبی احمد خاں ,, [illegible]
- ' مسلمان مشرک ' — — — — مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی [illegible]

شائع کردہ :

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

فون : 852683

اسرار احمد — بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تذکرہ وتبصرہ

دور حاضر میں علمِ طبعیات (PHYSICS) کی اعلیٰ ترین سطح پر تو اگرچہ آئن سٹائن کی "اضافیت" (RELATIVITY) کا طوطی بول رہا ہے، تاہم 'اصولِ حرکت' کے باب میں اساسی اور فیصلہ کن اہمیّت اب بھی نیوٹن کے "قوانینِ ثلثہ" ہی کو حاصل ہے ——— ان میں سے تیسرا کلیّہ جو گنتی کے اعتبار سے تو آخری ہے لیکن اہمیّت کے اعتبار سے ہرگز کہتر یا کمتر نہیں[1] ہے 'عمل' اور 'ردِّ عمل' کے باہمی تعلّق سے بحث کرتا ہے اور اس کی رُو سے: "ہر عمل کا ایک ردِّ عمل ہوتا ہے جو سمت کے اعتبار سے اس کے مخالف ہوتا ہے اور شدّت و قوّت کے اعتبار سے مساوی!"

گذشتہ دنوں راقم کا ذہن بے اختیار بار بار اس قانونِ طبعی کی طرف منتقل ہوا اور مخالفت کے اُس طوفان کی شدّت کے پیشِ نظر جو راقم اور اس کے کام کے خلاف مختلف گوشوں سے بیک وقت اٹھا 'عمل' اور ردِّ عمل کی باہمی مساوات کا یہ ضابطہ کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہوا، اِس لئے کہ راقم کے خیال میں اِس ردِّ عمل کی شدّت اس 'عمل' کی نسبت سے یقیناً بہت زیادہ تھی، جس کی توفیق تاحال راقم یا اُس کے رُفقاء کو بارگاہِ ربُّ العزّت سے حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ اس مخالفانہ پروپیگنڈے کی شدّت اور اُس کے لئے بالکل مختلف الخیال لوگوں کے باہمی گٹھ جوڑ سے جہاں بار بار یہ سوال ذہن میں اُبھر رہا کہ ع "الٰہی! جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟" —— وہاں بالکل غالبؔ کے اِس شعر کے سے انداز میں کہ "جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود، پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟" یہ اَچنبھا بھی ہوتا رہا کہ ابھی کام تو کچھ ہوا ہی نہیں، پھر مخالفت کا یہ 'ہنگامہ' اور اس کی اس درجہ شورا شوری آخر کیوں؟ ——— مزید برآں اس ضمن میں یہ تشویش بھی شامل رہی کہ اگرچہ دعوتوں اور تحریکوں کے باب میں بلاشبہ قاعدہ کُلیّہ یہی ہے کہ جب وہ زمین میں جڑ پکڑ چکتی ہیں تو "تندیٔ بادِ مخالف" اُن کے حق میں مُضر نہیں اُلٹی مفید ہوتی ہے۔ لیکن اگر مخالفت کی یہ آندھیاں قبل از وقت ہی چل پڑیں تو ظاہر ہے کہ کسی بھی دعوت یا تحریک کے لئے اُن کی مضرّت کا پہلو منفعت والے پہلو سے بڑھ جاتا ہے۔

---

[1] 'LAST BUT NOT THE LEAST !'

اپنی ذات کے بارے میں راقم کو ایک اور مخمصے کا احساس بھی بہت پہلے سے ہے، اور وہ یہ کہ ایک طرف تو مختلف گوشوں سے یہ بات راقم کے علم میں آتی رہی کہ بہت سے لوگوں کے نزدیک راقم میں تکبّر اور غرور پایا جاتا ہے، اور وہ خود پسندی ہی نہیں خود پرستی کا شکار ہے۔ اور دوسری جانب راقم نے جب بھی اپنے دل کو ٹٹولا' اور باطن کی گہرائیوں میں جھانکا اُسے اپنی ہیچ میرزی اور ہیچ مدانی اور فی الجملہ کچھ نہ ہونے کا احساس شدّت کے ساتھ موجود نظر آیا۔ چنانچہ اِس ضمن میں 'سمع' اور 'بصر' کا یہ اختلاف راقم کے لئے ایک پریشان کُن مسئلہ بنا رہا۔ اس سلسلے میں بارہا ایسا ہوا کہ راقم نے اس خیال سے کہ انسان کو اپنے عیب خود نظر نہیں آیا کرتے ہیں، لہٰذا اسے اپنی شخصیت کو دوسروں کی رائے کے آئینے میں دیکھنا چاہیئے۔ یہاں تک بھی سوچا کہ تحریر و تقریر اور درس و تدریس کا سلسلہ بند کر کے گوشہ گیری اختیار کر لی جائے۔ مبادا یہ سب کچھ صرف 'اظہارِ ذاتِ خویش' کے جذبے پر مبنی ہو اور خدا کے یہاں بجائے لینے کے الٹے دینے پڑ جائیں۔ لیکن پھر فوراً ہی یہ خیال بھی پوری شدّت کے ساتھ آیا کہ یہ کہیں شیطان ہی کی چال نہ ہو۔ اور اس وسوسہ اندازی سے وہ خیر کے اُس سلسلہ کو بند نہ کرا دینا چاہتا ہو جو تعلیم و تعلّمِ قرآن اور علم و حکمتِ قرآنی کی نشر و اشاعت کی صورت میں جاری ہے۔ الغرض ذہن و قلب کی دُنیا میں تو معاملہ وہ رہا کہ ؎

"اِسی کشمکش میں گُذریں مری زندگی کی راتیں — کبھی سوز و سازِ رُومی، کبھی پیچ و تابِ رازی"

لیکن عمل کے میدان میں جو بُری بھلی کوشش بن آئی اُس کا سلسلہ بہرحال جاری رہا۔ اِس ضمن میں یہ بات بھی ڈھارس بندھاتی رہی کہ جب حضرت حنظلہؓ ہی نہیں حضرت عمر فاروقؓ تک کو اپنے بارے میں نفاق کا اندیشہ رہا تو ——"تا بہ دیگراں چہ رسد!" ہم کس شمار قطار میں ہیں۔ صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ جس چیز پر دل ٹھک جائے، انسان اس پر عمل کئے چلا جائے اپنے ذہن و قلب کی شعوری سطح پر بھی نظر رکھے کہ وہاں کسی غلط جذبے یا محرّکِ عمل کو دخل حاصل نہ ہو جائے —— اور "تحت الشعور" اور "لاشعور" کی گہرائیوں سے اُبھرنے والے شیطانی وسوسوں سے اللہ کی پناہ طلب کرتا رہے —— اپنی اس 'داخلی کشمکش' کو راقم نے اس وضاحت کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اس لئے بھی منتقل کر دیا ہے کہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ راقم کی بعض ایسی تحریروں میں جنہیں راقم نے اپنی حد تک خالصتاً تحدیثاً للنّعمۃ سپردِ قلم کیا تھا۔ اگر بعض محبّین و مخلصین کو "عُجب"

اور خود پسندی نظر آئی ہے یا بعض بزرگوں نے انہیں محلِ نظر یا قابلِ اصلاح قرار دیا ہے .... تو راقم کو اس پر کسی سے ہرگز کوئی شکایت نہیں: "وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِيْ إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ!"

اپنے کاموں کے بارے میں بھی واقعہ یہ ہے کہ راقم کو یہ خیال تو مستقلاً ہی رہا ہے کہ ابھی اُن کی حقیقی معنوں میں ابتدا بھی نہیں ہوئی - بارہا ایسا بھی ہوا کہ شدّت کے ساتھ یہ احساس دامن گیر ہوا کہ جن عظیم کاموں کا بیڑہ راقم نے اُٹھا لیا ہے، اُن کی کم سے کم لازمی اور ناگزیر صلاحیت بھی راقم میں موجود نہیں ہے۔

جہاں تک 'تنظیمِ اسلامی' کا تعلق ہے، راقم اسی سال ماہ مارچ میں اِن صفحات میں بھی صاف لکھ چکا ہے کہ ابھی وہ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ کا مصداق بھی نہیں بنی اور حال ہی میں ایک سرکلر میں بھی جو راقم نے جملہ رُفقاءِ تنظیم کو ارسال کیا ہے، یہ الفاظ موجود ہیں: "تنظیمِ اسلامی' کو قائم ہوئے تین سال ہو گئے ہیں لیکن تاحال یہ ایک چلتے ہوئے قافلے" کی صورت اختیار نہیں کر سکی - اِس کے اسباب تین ہی قسم کے ہو سکتے ہیں: ایک ملک و ملّت کے عمومی حالات جو ہمارے اختیار سے باہر ہیں، دوسرے آپ حضرات کی کم کوشی - اور تیسرے میری نا اہلی - اگرچہ فی الواقع تو اس میں کم و بیش ان تینوں ہی عوامل کو دخل حاصل ہے - لیکن میرے نقطۂ نگاہ سے اہم ترین عامل تیسرا ہے - چنانچہ اِدھر کچھ عرصے سے یہ خیال میرے دل و دماغ پر شدّت کے ساتھ مستولی رہا ہے کہ جس عظیم کام کا بیڑہ میں نے اُٹھا لیا ہے غالباً میرے اندر اس کی ضروری اور مناسب صلاحیتیں موجود نہیں ہیں - اِس صورت میں، میں خواہ مخواہ کیوں کچھ لوگوں کو پریشان کئے رکھوں اور کیوں نہ اس لبساط کو تہہ کرنے کا اعلان کر دوں؟"

اِسی طرح مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کے بھی اصل منصوبے یعنی 'قرآن اکیڈمی' کے بارے میں راقم برملا اعتراف کرتا رہا ہے کہ تاحال اس کی حیثیت صرف ایک 'خواب' یا 'خیال' کی ہے - چنانچہ ۲۶ / جولائی ۷۸ء کو مخدومی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے قرآن اکیڈمی میں وُرُودِ مسعود کے موقع پر جو اجتماع منعقد ہوا تھا، اُس میں راقم نے تمہیدی یا استقبالی کلمات میں عرض کیا تھا:

"میں انتہائی مسرّت اور خوشی کے ساتھ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام قائم ہونے والی اس قرآن اکیڈمی میں مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا خیر مقدم کرتا ہوں ـــ ایسے مواقع پر استقبالی کلمات میں عام طور پر دو باتیں شامل ہوتی ہیں : ایک مہمانِ گرامی کا تعارف اور اُن کے محامد و اوصاف کا ذکر، اور دوسرے اُس ادارے کا تعارف جہاں مہمانِ عزیز کا وُرُودِ میمنت لزوم ہوتا ہے ـــ لیکن آج کی یہ مجلس ایک عجیب استثنائی شان کی حامل ہے کہ یہاں مہمان اور ادارہ دونوں کا تعارف بالکل بے محل ہے۔ مہمان کا اِس لئے کہ بحمد اللہ و بفضلہٖ مولانا علی میاں اب سے بہت پہلے اس منزل سے گذر چکے ہیں جہاں اُن کی ذات کسی تعارف کی محتاج ہوتی اور وہ اللہ کے فضل و کرم سے اب شہرت و مقبولیت کے اُس مرتبہ و مقام پر فائز ہیں کہ کسی محفل یا مجلس میں اُن کا تعارف کرانے کی کوشش، اُن کی توہین پر محمول کی جا سکتی ہے ـــ اور ادارے کا اِس لئے کہ ابھی یہ اِس قابل ہی نہیں کہ اِس کا تعارف کرایا جا سکے۔ اور اگرچہ پیشِ نظر نقشے کے اعتبار سے تعمیر کا پروگرام نصف سے زائد مکمل ہو چکا ہے اور بہت سی اینٹیں اُوپر تلے رکھی جا چکی ہیں، اور لوہے، بجری اور سیمنٹ پر مشتمل اچھا بھلا خوش منظر و خوش ہیئت انبار وجود میں آ چکا ہے۔ تاہم اصل مقصد کے اعتبار سے اُس کی حیثیت تا حال "خواب و خیال" سے زیادہ نہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ : ؎ گرچہ خُورد یم نسبتے است بزرگ ! اُس لئے کہ خواب و خیال کی حد تک اس ادارے کی تاریخ اس پوری صدی پر پھیلی نظر آتی ہے۔ یہی خواب تھا جو اس صدی کے بالکل آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "دارُالارشاد" کی صورت میں دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ خواب محض ہی رہا اور غالباً اس نام سے کچھ اینٹیں بھی کہیں دھری نہ جا سکیں، پھر یہی خواب ٹھیک تیس سال بعد امّت کے ایک اور رجلِ عظیم اور بطلِ جلیل علامہ اقبال مرحوم نے دیکھا جس کے نتیجے میں "دارالاسلام" کے نام سے ایک ادارہ بھی وجود میں آیا اور کچھ عمارتیں بھی عالمِ واقعہ میں ظہور میں آ گئیں۔ لیکن جس مقصد کے لئے وہ قائم ہوا تھا بوجوہ اُس کا آغاز بھی نہ ہو سکا۔ اگرچہ یہ سعادت اُس کے حصّے میں ضرور آ گئی کہ برِّ صغیر ہند و پاک کی ایک عظیم اسلامی تحریک کا ابتدائی گہوارہ بن گیا ـــ اس کے ٹھیک تیس ہی سال بعد ۱۹۶۷ء میں یہ خواب اُمّت کے ایک ناکارہ ناتواں فرد نے پھر دیکھا اور اس بار اِس کا نام "قرآن اکیڈمی" تجویز ہوا۔ لیکن عالمِ واقعہ

میں اِس بندۂ عاجز و ناکارہ کی اِس گیارہ سال کی محنت و مشقت کا حاصل تا حال بس یہی کچھ ہے کہ کچھ دیواریں کھڑی ہوگئی ہیں اور اُن کو چھتوں نے بھی ڈھانپ لیا ہے۔ رہا اصل مقصد، تو اُس کی جانب صحیح معنوں میں پیش قدمی کا آغاز بھی ابھی نہیں ہوا[1]۔

الغرض، یہ ہے راقم الحروف کا خیال اپنی ذات اور اپنے کام کے بارے میں اور یہ ہے وہ پس منظر جس میں راقم کو اپنی مخالفت اور اُس کی شدت کے ضمن میں 'عمل' اور 'ردِ عمل' کی مساوات کا قانون ٹوٹتا سا محسوس ہوا۔ اِس لئے کہ جہاں تک دو حلقوں کی جانب سے مخالفت کا تعلق ہے، وہ تو راقم کے حق میں 'حادث' نہیں 'قدیم' ہے۔ یعنی اوّلاً ایک خاص مکتبِ فکر کے مولویوں کی طرف سے جن کا دین عبارت ہے صرف عُرس کے میلوں' میلاد کے جلسوں اور جلوسوں اور گیارھویں کی نیازوں سے ۔ اُن کی طرف سے جو باتیں وقتاً فوقتاً کہی گئیں اور تہمتیں جڑی گئیں، اُن پر راقم کو کبھی ملال تک نہیں ہوا۔ بلکہ اُن کو تو ہمیشہ راقم نے اپنے حق میں ایک 'سند' سمجھا اُس کی کہ بحمد اللہ راقم توحید کی راہ پر گامزن ہے۔ اور ثانیاً ایک نیم سیاسی و نیم مذہبی جماعت کی جانب سے جس کے ساتھ خود راقم کا معاملہ یہ رہا ہے کہ
ع "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ!" اس لئے کہ وہ خود راقم کا ماضی ہے اور ؎ :

"گذشتہ منزلیں' منزل بمنزل یاد آتی ہیں ❊ مسافر! یہ خلش دل کی بآسانی نہیں جاتی!"

کے مصداق اپنے ماضی کو انسان لاکھ کوشش کرے بالکل بھُلا دینے پر قادر نہیں ہوتا۔ البتہ جب تبلیغی جماعت کے اربابِ حلّ و عقد کے ایک حلقے کا یہ رویّہ سامنے آیا کہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا راقم کے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمانا اور ما حضر تناول فرما لینا

---

[1] اِس کے بعد راقم نے 'قرآن اکیڈمی' کے مقاصد دَورِ حاضر کے فکری رجحانات، مغربی تہذیب کے عالمگیر تسلّط و استیلاء اور اِس پس منظر میں اعلیٰ ترین علمی و فکری سطح پر دعوتِ ایمان کی ضرورت و اہمیت کے حوالے سے اجمالاً بیان کئے اور اِس ضمن میں خود مولانا علی میاں مدظلہٗ کی تالیفِ لطیف کا حوالہ بھی دیا اور ڈاکٹر رفیع الدّین مرحوم کی تصانیف کا بھی' اور اُمید تھی کہ مولانا اِس موضوع پر کچھ ارشاد فرمائیں گے۔ لیکن افسوس کہ بوجوہ مولانا نے اپنی تقریر میں اِدھر التفات نہیں فرمایا، اگرچہ دوسری بہت سی قیمتی اور قابلِ قدر باتیں ارشاد فرمائیں۔ مولانا کی یہ تقریر ٹیپ سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے مولانا کو ارسال کی جا رہی ہے — اور ان شاء اللہ جلد ہی اُن کی جانب سے حک و اضافہ کے ساتھ یا اگر انہوں نے پسند فرمایا تو جُوں کی تُوں ہدیۂ ناظرین کر دی جائے گی!

اُن کے لئے وبالِ جان بن گیا۔ یہاں تک کہ جب "کرم بارِ دگر" کے طور پر قرآن اکیڈمی میں اجتماع سے خطاب کرنے کا مرحلہ آیا تو اس کی اجازت انہیں بہت سی معذرتوں اور یقین دہانیوں کے بعد ہی مل سکی — اور دوسری طرف تھانوی حلقے کے بعض قابلِ احترام بزرگوں کی یہ روش سامنے آئی کہ خود ایک حد درجہ مہمل فتویٰ رقم فرما کر (جس کو پڑھ کر ممکن ہی نہیں کہ کوئی صاحبِ علم شخص "گر ہمیں مفتی، و ہمیں 'فتویٰ'؛ کارِ افتاء تمام خواہد شد!" کہے بغیر رہ سکے!) اس کی تائید و توثیق کے لئے ع: "میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا!" کے مصداق بہ نفسِ نفیس چل کر 'جامعہ مدنیہ' تشریف لے[1] گئے۔ تب مجبوراً سوچنا پڑا کہ: ع: "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے!"[2] اور راقم کی حقیر و بے وقعت شخصیت ان حضرات کیلئے 'ھوّا' کیوں بن گئی ہے؟

گذشتہ تین چار ماہ سے راقم اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ ایک روز اچانک راقم کا ذہن آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ایک دُعا کی جانب منتقل ہوا جو کبھی ادعیۂ ماثورہ کے ضمن میں پڑھنے میں آئی تھی اور یادداشت کے وسیع و عریض "محافظ خانے" میں کہیں فائلوں کے انبار تلے دبی پڑی تھی اور اس سوچ بچار کے دوران اچانک ابھر کر شعور کی سطح پر تیرنے لگی — یعنی: "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا!"[3] (اے اللہ! تو مجھے خود اپنی آنکھ میں تو چھوٹا بنا دے، لیکن لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا!") تب محسوس ہوا کہ یہی اس اشکال کا واحد ممکن حل ہے۔ اس لئے کہ راقم تو اپنی جگہ جو کچھ اور جیسا کچھ ہے سو ہے، اور اس ضمن میں تو "من آنم کہ من دانم!"

---

[1] یہ دوسری بات ہے کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دُہرایا اور جس طرح مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمہ اللہ مولانا حمید الدّین فراہیؒ کے خلاف جاری ہونے والے فتوے کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گئے تھے، اسی طرح اُن کے معنوی جانشین مولانا سیّد حامد میاں مدّظلّہٗ اور مولانا عبید اللہ انور مدّظلّہٗ اور محترم مولانا مفتی عبد الحمید صاحب نے اُن کی اِس کوشش کو بھی ناکام بنا دیا۔ فجزاہم اللہ احسن الجزاء

[2] اِس معاملے کا یہ پہلو بھی دلچسپی کا حامل ہے کہ اِس کے باوجود کہ راقم نے دیوبند دیکھا تک نہیں اور وہ نہ 'تھانوی' ہے نہ 'مدنی' بلکہ عُرفِ عام کے مطابق تو وہ پُورا پُورا مقلّد حنفی بھی نہیں تاہم جو احترام اُس کی نگاہ میں اکابرِ دیوبند کا ہے، اُس کی بنا پہ اہلِ حدیث اور بریلوی دونوں مکاتبِ فکر کے لوگ اسے دیوبندیوں ہی کے ساتھ شمار (IDENTIFY) کرتے ہیں، گویا معاملہ بالکل وہ ہے جو غالبؔ کے اس شعر کے مصرعۂ اوّل میں بیان ہوا کہ: ع "ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار!"

کے بجائے بھی صحیح تر بات یہ ہے کہ "من آنم کہ اُو داند!" یعنی میری اصل حقیقت تو وہ ہے جو اللہ کے علم میں ہے! ـــــ البتہ مخالفین کی آنکھوں پر کسی سبب سے محدّب عدسے چڑھ گئے ہیں، اور وہ راقم کو اُس کے اصل حجم سے بہت بڑا دیکھ رہے ہیں!

ذہنِ انسانی کا عظیم کمپیوٹر یقیناً "اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی" میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اور اِنتقالِ ذہنی کا عمل جس پر انسان کو قطعاً کوئی اختیار اور کنٹرول حاصل نہیں ہوتا بسا اوقات عجیب کرشمے دکھاتا ہے۔ چنانچہ متذکرہ بالا خیال کے ساتھ ہی راقم کے ذہن سے گویا ایکدم ایک پردہ سا ہٹ گیا اور بعض بالکل دوسرے ہی حقائق سامنے آئے جن کی روشنی میں مخالفت کا سارا شور و غل ایک بشارت کی صورت اختیار کر گیا اور اس میں "وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا" کا عکس اور بلاتشبیہ "وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ" کی جھلک نظر آئی اور بےاختیار ذہن اللہ تعالیٰ کے ان عظیم احسانات اور بےپایاں عنایات کی جانب منتقل ہو گیا جو اس عبدِ ضعیف اور بندۂ ناچیز پر ہوئے ہیں۔

تب احساس ہوا کہ کیا یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم ترین احسان نہیں ہے کہ وہ دین سے اس دُوری اور قرآن سے اس مجبولی و مہجوری کے دور میں ہیچ کسی بندے کو اپنی کتابِ حکیم کے پڑھنے پڑھانے، سیکھنے سکھانے اور اس کے حقائق و معارف اور علوم و حِکَم کو

سکے راقم کو اِس دُعا کا حوالہ تو فوری طور پر نہیں مل سکا، البتہ ایک روایت اس کے مضمون سے ملتی جلتی 'معارف الحدیث' مُرتّبہ مولانا محمد منظور نعمانی مدّظلّہ' کی جلد دوم میں مل گئی جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

عن عمر رضی اللہ عنہ قال وَھُوَ علی المنبر: یا ایّھا النّاس تواضعُوا فانّی سمعتُ رسول اللہ صلّی اللہُ علیہ وسلّم یقول: مَن تواضَعَ لِلّٰہ رَفَعَہُ اللّٰہُ فَھُوَ فی نفسہ صغیرٌ وفی اعینِ النّاسِ عظیمٌ ومن تکبّر وَضَعَہُ اللّٰہُ فَھُوَ فِی اَعْیُنِ النّاسِ صغیرٌ وَ فِی نفسہ کبیرٌ حتّی لَھُوَ اَھْوَنُ علیھم من کلبٍ اَوْ خِنزِیرٍ (رَوَاہُ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے ایک دن خطبہ میں برسرِ منبر فرمایا: "لوگو! فروتنی اور خاکساری اختیار کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے۔ آپ فرماتے تھے: جس نے اللہ کے لئے تواضع کی روِش اختیار کی، اللہ اُس کو بلند کرے گا چنانچہ وہ خود اپنی نگاہ میں تو چھوٹا ہو گا لیکن لوگوں کی نگاہوں میں بڑا ہو گا۔ اور جو کوئی تکبر کرے گا اللہ اُسے نیچے گرا دے گا۔ پھر وہ خواہ اپنی نگاہ میں کتنا ہی بڑا ہو، لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے گا، یہاں تک کہ وہ اُسے کُتّے اور سُوّر سے بھی کمتر خیال کریں گے!"

دُنیا میں عام کرنے کے لئے اس طرح "خالص" کر لے کہ اسے دُنیا کی کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی اور سروکار ہی باقی نہ رہے؟ اور کیا اس کیفیت کو کوئی معنوی نسبت حاصل نہیں اُن الفاظ مبارکہ سے جو سورۂ صٓ میں وارد ہوئے یعنی "اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ" ـــــ "ہم نے ان کو خالص کر لیا تھا ایک خاص کام ـــــ دار آخرت کی یاد دہانی ـــــ کے لئے! ـــــ ؟

پھر کیا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی بندۂ حقیر کا یہ اعزاز و اکرام کچھ کم ہے کہ وہ اس کے نام کو اپنی کتاب عزیز کے ساتھ اس طرح نتھی کر دے کہ ملک کے طول و عرض میں جہاں قرآن کا ذکر آئے وہاں ذہن از خود اس کے نام کی جانب منتقل ہو جائے؟ ـــــ اس کے بعض شواہد پہلے بھی سامنے آئے تھے اگرچہ ان میں بعض لوگوں کے احساس کمتری اور مرعوبیت کا ایک بھونڈا سا مظاہرہ بھی شامل ہے مثلاً یہ کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہونے والی شاندار قرآن کانفرنسوں کا اثر یہ نظر آیا کہ اب کراچی اور لاہور کے اخبارات میں آئے دن 'قرآن کانفرنس' کے انعقاد کی اطلاعات چھپتی رہتی ہیں اور حفظ و تجوید کے مدارس اپنے جلسوں کو بھی 'قرآن کانفرنس' کے نام سے موسوم کرتے ہیں (ایسی ایک 'کانفرنس' میں راقم بھی بعض رفقاء کی معیت میں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ شرکت کے لئے گیا تو ع "دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشا نہ ہوا!" کے مصداق یہ دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی کہ 'کانفرنس' میں سامعین کا "ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" مدرسے کے پچاس ساٹھ طلبہ کے علاوہ قریبی آبادی کے زیادہ سے زیادہ دس پندرہ نفر کا مشتمل تھا!) ـــــ حال ہی میں اس کا ایک دوسرا مظہر اس صورت میں سامنے آیا کہ راولپنڈی ٹیلی ویژن والوں نے اس سال ماہ رمضان مبارک میں "الکتٰب" کے نام سے ایک پروگرام نشر کرنے کا فیصلہ کیا جس میں روزانہ کل دس منٹ میں ایک ایک پارے کے بارے میں ناظرین و سامعین کو کچھ بتایا جانا تھا تو ع "قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند!" والا معاملہ ہوا۔ اور راولپنڈی ٹیلی ویژن کے ایک ذمہ دار کارکن اس کے لئے باقاعدہ لاہور تشریف لائے۔ ادھر راقم کے مزاج اور افتاد طبع کا انداز اس قسم کے کاموں سے بُعد و دوری کا عالم یہ ہے کہ اگر اتفاقاً ان صاحب کی آمد کے موقع پر انجمن کی مجلس منتظمہ کا اجلاس نہ ہو رہا ہوتا اور ان کی بات براہ راست اس اجلاس ہی میں پیش نہ ہوئی ہوتی اور تمام اراکین مجلس کا متفقہ فیصلہ نہ ہوتا تو شاید راقم معذرت ہی کر لیتا۔ (شاید اکثر لوگوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو کہ راقم کے گھر میں تاحال بھی ٹیلی ویژن سٹ موجود نہیں ہے اور راقم کو ٹیلی ویژن پر خود اپنے پروگرام دیکھنے کا اتفاق بھی شاذ ہی ہوا ہے!) ـــــ مزید برآں پروگرام کی ریکارڈنگ کے دوران راقم کا احساس تو مسلسل یہ رہا کہ اس کی ادائیگی ہرگز اطمینان بخش نہیں ہے اور وہ اس پروگرام کا حق بالکل ادا نہیں کر پا رہا۔ اس لئے کہ ایک تو ماحول نہایت نامانوس، دوسرے یہ صورت حال خالص مصنوعی کہ سامنے سامعین کوئی موجود نہیں اور مخاطب صرف کیمرہ ہے لیکن اس کے باوجود انداز تقریر کا رکھنا ہے اور لکھا ہوا پڑھنا تو در کنار کوئی نوٹس یا یادداشت بھی سامنے رکھنے کی اجازت نہیں ـــــ لیکن اس سب کے باوجود بعد میں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حقیر بندے کی اس سعیٔ ناقص کو بھی قبول عام کا مقام عطا فرما دیا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ ـــــ فَلَهُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة

ہو سکتا ہے کہ ان باتوں میں بھی بعض حضرات کو تعلّی اور عجب کی بُو محسوس ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان سے مقصود "تحدیث نعمت" کے سوا اور کچھ نہیں!

گذشتہ رمضان مبارک میں مسجد خضراء سمن آباد میں اجتماع جمعہ سے خطاب کے دوران راقم کا ذہن اچانک ایک عظیم بشارت

ڈاکٹر اسرار احمد

صراطِ مستقیم (نشری تقاریر)

(سُورۂ ھود)

(۱)

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ؕ اَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ ۙ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۚ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝

سُورۂ ہود کی ابتدائی پانچ آیات کا ترجمہ یہ ہے :

"الف، لام، را ۝ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں اور پھر اُن کی تفصیل کی گئی، اُس ہستی کی جانب سے جو حکیم بھی ہے اور خبیر بھی، کہ تم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ میں تمھارے لئے اُس کی جانب سے خبردار کرنے والا بھی ہوں اور بشارت دینے والا بھی، اور یہ کہ تم اپنے ربّ سے مغفرت چاہو، پھر اُس کی طرف رجوع کرو۔ وہ ایک طے شدہ مدّت تک تمھاری ضروریات بہترین طور پر پوری فرمائے گا اور ہر مستحقِ فضل کو اپنے فضل سے نوازے گا، اور اگر تم رُوگردانی کرو گے تو مجھے اندیشہ ہے تمھارے بارے میں ایک ہولناک دن کے عذاب کا! یقیناً اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ دیکھو! یہ لوگ اپنے سینے دوہرے کئے لیتے ہیں تاکہ کسی طرح اُس سے چھُپ سکیں۔ آگاہ رہو کہ یہ جب اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ رہے ہوتے ہیں اُس وقت بھی اُس کی نظر میں ہوتے ہیں۔ اُس کے علم میں ہے جو کچھ وہ ظاہر کرتے ہیں اور جو کچھ چھُپاتے ہیں، اور وہ تو سینوں کے بھیدوں سے بھی خوب واقف ہے!"

اِن آیات کا آغاز حُروفِ مقطّعات الف لام را سے ہوتا ہے جو اس گروپ کی پانچ سورتوں کے آغاز میں آتے ہیں اور جن کے حقیقی اور واقعی مفہوم کو قطعی اور حتمی طور پر اللہ، اور

اُس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

اِس کے فوراً بعد قرآنِ حکیم کی عظمت کا بیان ہے اور یہ دراصل شرح ہے ان مختصر الفاظ کی جن سے اس سے پہلی سورت یعنی سورۂ یونس کا آغاز ہوتا ہے۔ وہاں فرمایا: "یہ ایک حکمت والی کتاب کی آیات ہیں !"۔ اور یہاں مزید وضاحت کر دی گئی کہ قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ اس کی آیات پہلے پختہ اور محکم کی گئیں یعنی چھوٹی چھوٹی آیتوں، اور چھوٹی چھوٹی سورتوں میں حقائق و معارف اور معانی و مفاہیم کے دریا گویا کوزوں میں بند کر دیئے گئے اور پھر بڑی بڑی آیتوں اور طویل سورتوں میں ان ہی حقائق و معارف اور معانی و مفاہیم کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا۔ جیسے توحید کے بیان میں سورۂ اخلاص کہ اپنے غایت درجہ اختصار کے باوصف بڑی بڑی سورتوں پر بھاری ہے۔ چنانچہ آنحضورؐ نے اسے "ثلثِ قرآن" یعنی ایک تہائی قرآن کے ہم وزن قرار دیا ہے۔ اسی طرح 'راہِ نجات' اور اس کے مراحل و لوازم کے بیان کے ضمن میں سُورۂ والعصر، جس کے بارے میں حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول ہے کہ: لو تدبّر النّاس هٰذهِ السُّورة لوسعتهم: یعنی اگر لوگ صرف اس ایک ہی سورت پر تدبّر کا حق ادا کر دیں تو یہ اُن کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے کافی ہو جائے گی۔ بعد ازاں یہی مضامین ہیں جو طویل سورتوں میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان ہوئے !

عظمتِ قرآن کے فوراً بعد مقصدِ قرآن کا بیان ہوا۔ یعنی ایمان باللہ اور التزام توحید کی دعوت اور خاص طور پر عبادت اور بندگی کو خالصتًہ اللہ ہی کے لئے مخصوص کر لینے کا اہتمام و التزام! واضح رہے کہ از روئے قرآن مجید انسان کی غایتِ تخلیق ہی یہ ہے کہ وہ اللہ کی بندگی اور عبادت کرے بفحوائے الفاظِ قرآنی: "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝" (یعنی میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں) بقول شیخ سعدیؒ

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی

چنانچہ یہی تمام انبیاء و رُسُل کی دعوت کا مرکزی اور اساسی نکتہ رہا ہے کہ: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔" یعنی اللہ کی بندگی اور پرستش کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں ہے!" اور یہی آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت کا وہ

بنیادی نکتہ ہے جو قرآنِ حکیم کے بالکل آغاز میں چند تمہیدی مضامین کے فوراً بعد ان الفاظ میں بیان ہوا کہ : یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ۔" اے لوگو! اے انسانو! اے بنی آدم! بندگی اور پرستش کرو اپنے اس پروردگار کی جس نے تمہیں بھی پیدا فرمایا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں!" — اب یہاں یہی بات سلبی اسلوب میں یعنی: "بندگی مت کرو اللہ کے سوا کسی اور کی!" کے الفاظ میں قرآن کے مقصدِ نزول کے طور پہ بیان ہو رہی ہے!

جمہور ائمۂ لغت کے نزدیک عبادت کے معنی کسی کے سامنے عاجزی اور تذلّل اختیار کرنے کے ہیں یعنی کسی کے سامنے جھک جانا، پست ہو جانا، بلکہ واضح تر الفاظ میں اپنے آپ کو بچھا دینا۔ امام ابنِ تیمیہؒ اور حافظ ابنِ قیم رحمہما اللہ نے اللہ کی عبادت کے ضمن میں اس عاجزی اور تذلّل کے ساتھ ساتھ عشق و محبت کو بھی لازمی قرار دیا ہے بقول حافظ ابنِ قیمؒ : العبادة تجمع اصلین : غاية الحب مع غاية الذل و الخضوع (— عبادتِ الٰہی دو جڑوں یا بنیادوں پہ قائم ہوتی ہے : ایک اللہ کی حد درجہ محبت اور دوسرے اس کے سامنے انتہائی درجے کا تذلّل و انکسار) عبادت کے لوازم میں یقیناً اطاعتِ کاملہ بھی شامل ہے بلکہ اس کا جسدِ ظاہری اسی اطاعتِ کلّی سے عبارت ہے — لیکن اس کی روح باطنی محبتِ خداوندی کا جذبہ ہے بقول علامہ اقبال مرحوم : ؎

شوق اگر ترا نہ ہو میری نماز کا امام — میرا سجود بھی حجاب میرا قیام بھی حجاب
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق — عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

عبادتِ ربّ کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ذکر بھی ہو گیا : میں اللہ کی طرف سے تمہارے لئے نذیر اور بشیر بن کر آیا ہوں۔ یہ دو الفاظ مقصدِ بعثتِ انبیاء کے بیان کے ضمن میں قرآن مجید میں تکرار و اعادہ وارد ہوتے ہیں۔ جیسے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ؕ" اور اس قرآن کریم کو حق کے ساتھ نازل فرمایا ہے، اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر بشیر و نذیر بنا کر!"

آگے اس تبشیر و انذار کی تفصیل ہوئی ہے — یعنی یہ کہ اگر تم اللہ کی جناب میں

استغفار کرو اور اُس کی طرف رجوع کرو جیسا کہ رجوع کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں دُنیا اور آخرت دونوں کی بھلائیوں سے سرفراز فرمائے گا۔ چنانچہ اس دنیا میں بھی جب تک یہ ہوگے متاعِ حَسَنہ سے نوازے جاتے رہوگے ___ اور آخرت میں بھی اللہ کے فضلِ خاص سے حصّہ پاؤ گے، اور اگر اس کے برعکس اعراض و انکار اور تمرّد و استکبار کی رَوِش اختیار کروگے جو عبادت اور عجز و تذلّل کے برعکس کیفیّت ہے تو اس دُنیا میں بھی اندیشہ ہے کہ تم پر کسی ہولناک دن میں اللہ کا عذابِ استیصال اچانک مُسلّط ہو جائے اور تم نیست و نابود کر دیئے جاؤ، جیسے اس سے پہلے بہت سی اقوام و اُمَم عالَم ہو چکی ہیں۔ اور اس کے بعد جب اس دُنیا سے لوٹ کر تم اپنے ربّ کے حضور میں حاضر ہو تو وہاں بھی وہ تمہیں دردناک عذاب میں جھونک دے!

آخر میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مخالفین و معاندین میں سے بعض لوگوں کی ایک عجیب کیفیّت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اس کے بارے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں متکبّرین اور متمرّدین کے تمرّد و استکبار کا نقشہ کھینچا گیا ہے یعنی جب آن حضورؐ اُن کو دعوت دیتے ہیں اور قرآن پڑھ کر سُناتے ہیں تو یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے اور اپنے کپڑوں کو ٹھیک کر کے اپنے گرد لپیٹتے ہوئے چل دیتے ہیں اس لئے کہ آنحضورؐ انہیں عذابِ الٰہی کی جو دھمکی سُنا رہے ہیں وہ اُس سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس آیت کی یہ تاویل بھی درست ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں ایک نقشہ اُن لوگوں کا بھی کھینچ دیا گیا ہے جو اپنے دل میں تو اس دعوت کے قائل ہو چکے ہیں، اور اس کے علانیہ انکار کی جرأت نہیں کر سکتے۔ لیکن چونکہ انھیں لذّاتِ دُنیوی نے اپنا اس قدر گرویدہ بنا لیا ہے اور وہ اپنی دولت و ثروت اور جاہ و حشمت کے اس درجہ قیدی بن چکے ہیں کہ اس دعوتِ حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں جس کے نتیجے میں انہیں فی الوقت آرام و آسائش کو تج کر تکلیف و مشقّت مُول لینی پڑتی ہے لہٰذا وہ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے بھی کنّی کترا جانے ہی میں عافیت دیکھتے ہیں اور اپنی حماقت میں یہ بھی گمان کر رہے ہیں کہ اس طرح وہ اللہ سے بھی اپنے آپ کو چھُپا لیں گے! حالانکہ یہ بے وقوف ان منافقوں کی طرح جو اپنے زعم میں تو اللہ اور اہلِ ایمان کو دھوکا دیتے ہیں: "یُخَادِعُوْنَ اللّٰہَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" لیکن اصلاً صرف خود اپنے آپ ہی کو دھوکا دیتے ہیں: وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَھُمْ

خود ہی دھوکے میں آگئے ہیں۔ حالانکہ اللہ تو خوب باخبر ہے اس سے بھی جو وہ ظاہر کرتے ہیں اور اُس سے بھی جو وہ چھپاتے ہیں، اور وہ تو لوگوں کے سینوں میں چھپی ہوئی نیتوں اور دلوں میں مخفی عزائم اور ارادوں سے بھی اچھی طرح واقف ہے! — یہ دراصل ایک نفسیاتی مرض ہوتا ہے اور اس میں بسا اوقات بڑے بڑے ذہین و فطین لوگ بھی مبتلا ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ اس قسم کی ایک مثال علمائے یہود کے بارے میں ملتی ہے کہ وہ آپس میں کہا کرتے تھے کہ تورات کی تعلیمات مسلمانوں کے سامنے نہ بیان کیا کرو، مبادا وہ تم پر اُن ہی کے حوالے سے خدا کے یہاں حجت قائم کردیں: أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ — کیا تم ان مسلمانوں کو وہ باتیں بتارہے ہو جو اللہ نے تم پر کھولیں تاکہ وہ اُن کے ذریعے تمہارے ربّ کے یہاں تمہارے ہی خلاف حجّت قائم کریں؟ کیا عقل سے بالکل عاری ہوگئے ہو؟ — اس پر قرآنِ حکیم نے بالکل وہی تبصرہ فرمایا جو یہاں فرمایا گیا ہے یعنی: أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۝ "کیا اِن بے وقوفوں کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ خوب جانتا ہے اس کو بھی جو وہ چھپاتے ہیں اور اسے بھی جس کا یہ اعلانِ عام کررہے ہیں؟!" — واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کی نیّت میں خلل واقع ہوجاتا ہے اور وہ سب کچھ جان کر بھی کچھ جاننا نہیں چاہتا تو اس کی عقل پر ایسے ہی پردے پڑجاتے ہیں کہ وہ شُتر مرغ کے مانند ریت میں سر دے کر یہ سمجھتا ہے کہ بادِ سموم ٹل گئی، یا کبوتر کے مانند آنکھیں بند کرکے یہ اطمینان حاصل کرنا چاہتا ہے کہ بلّی موجود نہیں ہے۔ أَعَاذَنَا اللَّهُ مِنْ ذَٰلِكَ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝

---

(۲)

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۝
بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ ۝

وَلَئِنْ أَذَقْنَا الْإِنسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَئُوسٌ كَفُورٌ ۝ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝ إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ لَهُم مَّغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ كَبِيرٌ ۝

سورۂ ہود کی اِن آیات کا ترجمہ یہ ہے:

"اور اگر ہم انسان کو اپنی کسی رحمت سے نوازتے ہیں اور پھر اُسے اُس سے سلب

کر لیتے ہیں تو وہ نہایت مایوس ہو جاتا ہے اور حد درجہ ناشکرا بھی! اور اگر کسی مصیبت کے بعد جس میں وہ مبتلا ہوا ہو، اسے اپنی نعمتوں سے نوازتے ہیں تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میری ساری مصیبتیں رفع ہو گئیں اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا اور شیخی بگھارنے لگتا ہے۔ اِس سے مستثنیٰ اگر ہیں تو صرف وہ جو صبر کرنے والے اور نیک عمل کرنے والے ہیں۔ چنانچہ اُن ہی کے لئے بخشش بھی ہے اور بڑا اجر بھی!"

اِن آیاتِ مبارکہ میں اُن ظاہر بین لوگوں کی کیفیات بیان ہوئی ہیں جو ع نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم" کے مصداق نہ اپنے عزیز و قدیر خالق و مالک اور رؤف و رحیم پروردگار و پالن ہار پر ایمان رکھتے ہیں، نہ سفرِ حیات کی اصل منزل یعنی آخرت کا علم رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت اُن کی نگاہوں سے اوجھل رہ جاتی ہے کہ موجودہ زندگی یا حیاتِ دُنیوی تو ان کے طویل سفرِ حیات کا ایک مختصر اور حقیر سا وقفہ ہے جس کی اصل غرض و غایت ہی تکلیف و ابتلاء اور آزمائش و امتحان ہے، بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

"تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی"

"قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!"

نتیجۃً وہ اس زندگی ہی کو کل زندگی سمجھ لیتے ہیں اور ان کے نزدیک یہاں کی آسودگی و آسائش خوش بختی کی دلیلِ قاطع بن جاتی ہے اور یہاں کی محرومی یا تکلیف بدنصیبی کا اٹل ثبوت۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حیاتِ دُنیوی کے دوران بدلتے ہوئے احوال اور واقعات و حوادث کی اُونچ نیچ سے اُن کے قلوب و اذہان شدت کے ساتھ متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر کبھی آرام و آسائش سے بہرہ مند رہنے کے بعد کسی درجے میں محرومی کا سامنا ہوتا ہے۔ تو ان پر مایوسی کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اُن کی کمرِ ہمت ٹوٹ کر رہ جاتی ہے ــــ اور ساتھ ہی وہ سابقہ نعمتوں کو بھی بالکل بھول جاتے ہیں اور ایسے ناشکرے بن جاتے ہیں جیسے انہیں کبھی کوئی نعمت ملی ہی نہ ہو، اور اس کے برعکس اگر کبھی تنگیوں یا تکلیفوں سے دوچار رہنے کے بعد راحت و مسرت سے ہمکنار ہوتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے، اور اکڑنے اور اتراتے لگتے ہیں۔ گویا کہ حالات کی یہ تبدیلی اُن کی محنت و مشقت کا ثمرہ اور اُن کے حُسنِ تدبیر کا نتیجہ ہے۔ ساتھ ہی وہ سابقہ تکلیف دہ حالات کا خیال بھی دل سے نکال دیتے ہیں اور بزعمِ خویش یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اُن کے سب دلدر مستقل طور پر دور ہو گئے اور اب

کسی مصیبت کے لوٹ کر آنے کا کوئی امکان نہیں!

قرآنِ حکیم میں یہ مضمون بتکرار و اعادہ وارد ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا:

وَاِذَآ اَنۡعَمۡنَا عَلَى الۡاِنۡسَانِ اَعۡرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ‌ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَــُٔوۡسًا ۝ (آیت ۸۳)	(ترجمہ) اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اس کو نعمتوں سے نوازتے ہیں تو (ہم سے) روگردانی کرتا ہے اور پہلو موڑ لیتا ہے اور جب

کوئی تکلیف اسے لاحق ہوتی ہے، تو مایوس ہو کر رہ جاتا ہے ؎

اور سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنَّا رَحۡمَةً فَرِحَ بِهَا‌ ۚ وَاِنۡ تُصِبۡهُمۡ سَيِّئَةٌ ۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ فَاِنَّ الۡاِنۡسَانَ كَفُوۡرٌ ۝ (آیت ۴۸)	(ترجمہ) اور انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو اس پہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا۔ اور اگر کبھی اپنے ہاتھوں ہی کے کرتوتوں کے باعث کوئی مصیبت انہیں آ دبوچتی ہے تو انسان سخت ناشکرا بن جاتا ہے!

اِن آیات کی ہم مضمون اور بھی بہت سی آیات ہیں، جن میں واضح کیا گیا ہے کہ انسان کا یہ طرزِ عمل براہِ راست نتیجہ ہے اس کے حقیقتِ نفس الامری سے ذہنی و قلبی بُعد کا جس کے باعث اُن کی نگاہیں ظاہر ہی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں، بفحوائے الفاظِ قرآنی: "يَعۡلَمُوۡنَ ظَاهِرًا مِّنَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا" ۔ یعنی یہ لوگ آخرت سے تو بے خبر ہیں ہی، اِس حیاتِ دُنیوی کے بھی صرف 'ظاہر' سے واقف ہیں، اِس کی بھی اصل حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں! ۔ یہ مضمون اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے سورۂ فجر کی حسب ذیل آیات میں:

فَاَمَّا الۡاِنۡسَانُ اِذَا مَا ابۡتَلٰٮهُ رَبُّهٗ فَاَكۡرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَكۡرَمَنِ ۝ وَاَمَّاۤ اِذَا مَا ابۡتَلٰٮهُ فَقَدَرَ عَلَيۡهِ رِزۡقَهٗ ۙ فَيَقُوۡلُ رَبِّىۡۤ اَهَانَنِ ۝ كَلَّا	(ترجمہ) مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب اُس کا ربّ اُسے آزمائش میں مبتلا کرتا ہے۔ چنانچہ اسے عزّت بھی دیتا ہے اور نعمتوں سے بھی نوازتا ہے تو وہ یہ کہنے لگتا ہے کہ میرے ربّ نے مجھے عزّت بخشی اور جب وہ اسے آزماتا ہے (دوسری طرح) چنانچہ

اس پر رزق تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں!
(آیات ۱۵، ۱۶)

یعنی اگرچہ وہ اپنی عزّت و ذلّت کو اللہ ہی کی جانب منسوب کر رہا ہے، اس اعتبار سے مشرک ہرگز نہیں ہے کہ دولت مندی اور آرام و آسائش کو کسی لکشمی دیوی کی نگاہِ کرم کا ثمرہ سمجھتا ہو، اور رزق کی تنگی یا کسی اور مصیبت یا تکلیف کو کسی دوسری دیوی یا دیوتا کی ناراضگی کا نتیجہ ـــــ تاہم اس "فَضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا" سے رستگاری کے باوجود اس کی نگاہ پر ابھی ایک پردہ پڑا ہوا ہے، اور وہ یہ کہ وہ یہاں کی ظاہری اور عارضی اور صرف آزمائشی عزّت کو اصل عزّت سمجھ بیٹھا ہے اور یہاں کی فوری اور وقتی اور محض امتحانی سختی کو موجبِ ذلّت گردانتا ہے۔ حالانکہ یہ دُنیا صرف دارُالامتحان ہے۔ یہاں اللہ کبھی دے کر آزماتا ہے کہ انسان اللہ کا شکر کرتا ہے یا غرور و تکبّر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور مارے خوشی کے پھُولا نہیں سماتا ـــ اور کبھی کچھ چھین کر آزماتا ہے کہ انسان صبر کرتا ہے یا جزع فزع کرتا ہے اور بالکل مایوس اور ناامید ہو کر بیٹھ رہتا ہے۔

آیاتِ زیرِ بحث میں دُنیوی برنج و غم اور راحت و مسرّت کے مواقع پر ظاہر بین دنیا پرستوں کے احوال و کیفیّات کے اظہار کے لئے نہایت فصیح و بلیغ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یعنی پہلی صورت میں "یَئُوس" اور "کَفُور" ـــ اور دوسری حالت میں "فَرِح" اور "فَخُور"۔ 'یَئُوس' اور 'کَفُور' دونوں 'فَعُول' کے وزن پر مبالغے کے لئے آتے ہیں یعنی حد درجہ مایوس اور نہایت ناشکرا، جبکہ 'فَرِح' کا مفہوم ہے خوشی سے پھٹ پڑنا یا پھُولے نہ سمانا اور 'فَخُور' پھر 'فَعُول' ہی کے وزن پر اسم مبالغہ ہے یعنی حد درجہ شیخی خورا اور اپنے آپ پر اترانے والا!

اس کے بالکل برعکس کیفیّت ہے مومنینِ عارفین کی، جو دُنیا کے حالات کے ردّ و بدل اور حوادث و واقعات کی اُونچ نیچ سے زیادہ متاثّر نہیں ہوتے، بلکہ ہر حال میں صبر و شکر کی رَوِش پر قائم رہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس حیاتِ دُنیوی کے دوران خواہ راحت و مسرّت کا معاملہ ہو خواہ رنج و کلفت کا، ایک تو دونوں ہی عارضی بھی ہیں اور آنی و فانی بھی اور دوسرے دونوں اس اعتبار سے یکساں ہیں کہ دونوں ہی کی اصل علّت و غایت امتحان و آزمائش ہے۔ چنانچہ انہیں اگر کچھ ملتا ہے تو وہ اپنے

ربّ کے شکریے کے ساتھ اس کو قبول کرتے ہیں اور اتراتے اور اکڑتے نہیں ؛ اور اگر کبھی کچھ چھن جاتا ہے یا ہاتھ سے جاتا رہتا ہے تو صبر کرتے ہیں، اور نہ مایوس ہوتے ہیں نہ بے چین و مضطرب ! گویا ان کی کیفیت وہ ہوتی ہے جو سورۂ حدید کے ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ :

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ
(آیت ۲۳)

(ترجمہ) تاکہ تم مایوس نہ ہو جایا کرو اس پر جو تم سے چھوٹ جائے یا چھن جائے، اور اترایا نہ کرو اس پر جو تمہارا ربّ تمہیں عطا فرمائے ؛

شکر اور صبر میں سے بھی چونکہ صبر کا درجہ بلند تر ہے اس لئے کہ شکر کے ساتھ تو قرآن میں صرف یہ الفاظ آئے ہیں کہ : " لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ " یعنی اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور دوں گا ؛" اور صابرین کو اپنی معیّتِ خصوصی کی بشارت سنائی گئی بفحوائے الفاظِ قرآنی : "اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝" "اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ؛" لہٰذا آیاتِ زیرِ بحث میں صرف صبر کا ذکر کیا گیا، گویا اس تکمیلی مرتبے کے ذکر کے ساتھ شکر جو اساسی بنیادی وصف ہے وہ آپ سے آپ مندرج ہوگیا۔

اپنے عام اور مستقل قاعدے کے تحت قرآن نے یہاں صبر کے ساتھ عملِ صالح کا ذکر بھی کر دیا۔ تاکہ واضح ہو جائے کہ اہلِ ایمان اور عارفینِ باللہ کا صبر کوئی سلبی یا منفی قدر نہیں ہے بلکہ ایک مثبت جذبہ ہے جس کی کوکھ سے عملِ صالح جنم لیتا ہے۔ وہ عملِ صالح جو تہذیب و تمدّن کا انداز بدلتا اور تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑتا ہے، اور بقول علامہ اقبال مرحوم " وُسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل " کی صورت اختیار کرتا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہی لوگ ہیں اپنے ربّ کی مغفرت کے حقدار بھی اور اجرِ کبیر کے مستحق بھی ! — اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ ؛

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ
(الحدیث)

اسلامی ریاست میں
معاشرتی بہبود
کے کاموں کے لئے وسائل کی فراہمی

از: ڈاکٹر اسرار احمد

اسلامی ریاست میں معاشرتی بہبود کے کاموں کے لئے وسائل کی فراہمی کا مسئلہ بظاہر تو بہت سادہ اور آسان نظر آتا ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق لامحالہ حکومت کے پورے نظامِ آمد و خرچ سے ہے، لہٰذا اس کے ضمن میں کم از کم یہ ضرور دیکھنا ہوگا کہ اسلامی نظام میں حکومت کے لئے آمدنی کی مدّیں کون کون سی ہیں اور آیا اِن جملہ مدّوں سے وصول شدہ آمدن کو حکومت بلاتخصیص و تجدید جملہ انواع کے مصارف میں صرف کر سکتی ہے یا اُن کے صرف کے ضمن میں کوئی تخصیص و تجدید بھی موجود ہے اور اگر ہے تو پھر معاشرتی بہبود کے کاموں پر کن کن مدّات سے حاصل شدہ رقوم خرچ کی جا سکتی ہیں!

اس سلسلے میں یہ بات خواہ تحصیلِ حاصل ہی کے زُمرے میں آئے لیکن اپنی اہمیت کے پیشِ نظر اس قابل ہے کہ اس کا ضرور ذکر کر دیا جائے ـــــ کہ جہاں ایک طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے پاس دَورِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے کے جو نظائر موجود ہیں وہ نہ صرف یہ کہ بہت مختصر ہیں بلکہ اُس دَور سے متعلق ہیں جب کہ ابھی نہ تو ریاست کا موجودہ گھمبیر و ہمہ گیر تصوّر ہی وجود میں آیا تھا اور نہ ہی حکومت کے مختلف شعبوں کی اتنی وضاحت کے ساتھ تشکیل ہوئی تھی جتنی کہ آج کے ترقی یافتہ دَور میں ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ دَورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اجتہاد کے دروازے پر دستک دی جائے اور کمال حزم و احتیاط کے ساتھ استدلال و استنباط کے ذریعے اس دَور سے حاصل شدہ رہنمائی کو دَورِ حاضر کے لئے کار آمد بنایا جائے اس لئے کہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ کم از کم خلافتِ حضرت فاروقِ اعظمؓ اور خلافتِ حضرت عثمان غنیؓ کے دَور میں معاملاتِ حکومت نے اتنی وسعت اختیار کر لی تھی کہ دَورِ جدید کی ریاست (STATE) اور حکومت (GOVERNMENT) کے تمام شعبے خواہ درجہ جنین

(EMBRYONIC STAGE) ہی میں سہی، بہرحال وجود میں ضرور آگئے تھے۔ چنانچہ اس دَور کے نظائر سے دَورِ جدید کی ہمہ گیر ریاست اور اُس کے انتظام و انصرام کی ذمّہ دار ہمہ جہتی حکومتی مشینری کے پُورے ڈھانچے کی تخریج ہو سکتی ہے ـــــ وہاں دوسری طرف یہ بھی نہایت ضروری و لابُدی ہے کہ اگر واقعتہً اسلام ہی کو رہنمائی اور امامت کے منصب پر فائز کرنا ہے تو اس امر کے لئے پوری خوشدلی اور وسعتِ قلبی کے ساتھ تیّار رہنا چاہیئے کہ حکومت کے آمد و خرچ کے پورے نظام کو اُدھیڑ کر بالکل نئی بنیادوں پر از سرِ نَو تعمیر کیا جائے۔ اس لئے کہ کسی جُزوی پیوندکاری سے نہ صرف یہ کہ اصل مطلوب حاصل نہ ہو سکے گا بلکہ اندیشہ ہے کہ: "آدھا تیتر آدھا بٹیر!" قسم کا یہ نظام موجودہ نظام سے بھی زیادہ ناکام ثابت ہو اور اس سے خواہ مخواہ کی بدنامی دین و مذہب کے حصّے میں آئے!

آگے بڑھنے سے قبل ایک اور اُصولی بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیئے اور وہ یہ کہ اسلامی ریاست نہ تو صرف ایک "WELFARE STATE" ہے کہ اُس کے سامنے اپنے شہریوں کی دنیوی فلاح و بہبود کے سوا اور کوئی بلند تر نصبُ العین ہی نہ ہو ـــــ نہ ہی وہ صرف ایک "IDEOLOGICAL STATE" ہے بایں معنیٰ کہ اسے صرف اپنے مخصوص نظریے ہی کی اشاعت سے بحث ہو اور اس سے کوئی دلچسپی نہ ہو کہ "مُردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں!" یعنی اُس کے شہری سُکھ چین سے بھی بہرہ ور ہوتے ہیں یا نہیں؟ ـــ بلکہ وہ ان دونوں تصوّرات کی جامع ہے اس لئے کہ اُس کے پیشِ نظر اصل مقصد تو دنیا میں اسلام کی سربلندی یا قرآنی الفاظ میں: "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" ہے یعنی: "تاکہ غالب کر دے اُس کو سب ادیان یا کُل نظامِ زندگی پر!" یا حضرتِ مسیحؑ کے الفاظ میں یہ کہ: "اللہ کی مرضی جیسے آسمان پر پُوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر بھی پُوری ہو"! لیکن ساتھ ہی اسلامی ریاست اپنے جملہ شہریوں کے تمام بنیادی ضروریات کی کفیل بھی ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ "کفالتِ عامّہ" کا تصوّر انسانی تاریخ کے دوران پہلی بار خلافتِ راشدہ ہی کے زمانے میں سامنے آیا ـــــ گویا کہ جہاں مقدّم الذکر چیز کو اسلامی ریاست کا "نصب العین" قرار دیا جا سکتا ہے وہاں مؤخر الذکر چیز بھی کم از کم اس کے اہم ترین مقاصد میں ضرور شامل ہے!

اب آئیے کہ ہم دیکھیں کہ اسلامی ریاست میں حکومت کی آمدنی کی مدّیں کون کون سی ہیں؟ مولانا حفظ الرّحمٰن سیوہارویؒ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام"

(شائع کردہ ندوۃ المصنفین، دہلی) میں اسلامی حکومت کی آمدنی کی مدّات کا بہت عمدہ خلاصہ دیا ہے، جس کی رُو سے اسلامی حکومت کو کل ۱۲ مدّوں سے آمدنی ہو سکتی ہے۔

۱۔ عُشر ۲۔ زکوٰۃ ۳۔ صدقات ۴۔ خراج ۵۔ جزیہ ۶۔ فے ۷۔ خُمس ۸۔ عُشور ۹۔ کراء الارض ۱۰۔ ضرائب ۱۱۔ وقف۔ ۱۲۔ اموالِ فاضلہ ــــــ جن کی مختصر تشریح حسبِ ذیل ہے :

۱۔ عُشر : مسلمانوں کی مملوکہ اراضی کی پیداوار میں سے وصول شدہ حصّہ جو فطری طور پر سیراب شدہ زمینوں (یعنی دریا کے کناروں یا صرف بارش سے سیراب ہونے والے بارانی رقبوں) کی کُل پیداوار کے ۱/۱۰ اور مصنوعی ذرائع آبپاشی (یعنی کنوؤں اور نہروں وغیرہ) سے سیراب کی جانے والی زمینوں کی کُل پیداوار کے ۱/۲۰ کے حساب سے وصول کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ یہ شرح زکوٰۃ ہی کی طرح معیّن ہے۔ اور اس میں ردّ و بدل نہیں کیا جا سکتا، البتّہ نہری زمینوں سے آبیانہ وصول کیا جا سکتا ہے، جس کی کوئی شرح معیّن نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مصنوعی آبپاشی کے اخراجات کے پیشِ نظر ہی ایسی زمینوں کا عُشر نصف رکھا گیا ہے۔

۲۔ زکوٰۃ : مسلمانوں کے اموالِ نقد، اموالِ تجارت اور مویشیوں وغیرہ پر معیّن نصاب اور شرح کے حساب وصول ہونے والی آمدنی زکوٰۃ کہلاتی ہے۔ اس کی شرح بھی غیر مُتبدّل ہے۔ البتّہ اسے انفرادی طور پر صرف کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ لازماً اسلامی حکومت ہی کو ادا کی جاتی ہے۔

۳۔ صدقات : مسلمان زکوٰۃ کے علاوہ اپنی آزادانہ مرضی سے خیر کے کاموں کے لئے جو کچھ دیں وہ صدقات شمار ہوتے ہیں۔ اُن کو اگر لوگ نجی طور پر صرف کرنا چاہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ پسند کریں تو یہ رقوم بھی حکومت کے سپرد کر سکتے ہیں تاکہ وہ انہیں اجتماعی نظم کے تحت صرف کرے۔ اس کی کوئی مقدار معیّن نہیں۔ بلکہ اس کے ضمن میں عمومی رہنمائی اور تشویق و ترغیب کے لئے فرما دیا گیا کہ ہر شخص کے پاس جو کچھ زائد از ضرورت ہے وہ اسے اِس مدّ میں صرف کر دینا چاہئے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۹ میں فرمایا : ــــــ

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط (وہ پوچھتے ہیں کتنا خرچ کریں؟ کہہ دو جو بھی فاضل ہے!)

۴۔خراج : غیر مسلموں کی مملوکہ اراضی سے حاصل ہونے والی سالانہ مالگذاری کا نام خراج ہے۔اور اس کی کوئی شرح معیّن نہیں۔حکومتِ وقت حسبِ حالات اُس کی تعیین کر سکتی ہے !

۵۔جزیہ : غیر مسلموں پر جو سالانہ ٹیکس عائد کیا جائے وہ جزیہ ہے اور خراج کی طرح اس کا بھی نہ کوئی معیّن نصاب ہے نہ مقرر شرح، بلکہ یہ بھی حسب حالات گھٹایا اور بڑھایا جا سکتا ہے !

۶۔فے : حکومت کو غیر اقوام سے جو کچھ بغیر جنگ کے ہاتھ آئے وہ فے ہے۔

۷۔خُمس : کے معنی ہیں پانچواں حصّہ (۱/۵) اور یہ اسلامی حکومت میں حسبِ ذیل ذرائع سے حاصل ہوتا ہے i) اموالِ غنیمت کا ۱/۵ یعنی ان اموال کا پانچواں حصّہ جو دشمنوں سے جنگ کے نتیجہ میں ہاتھ آئیں اور ii) معدنیات اور زمینوں کا ۱/۵ جو لوگوں کی مملوکہ اراضی سے برآمد ہوں۔

۸۔عُشور : درآمد اور برآمد کئے جانے والے سامان پر عائد شدہ محصول (DUTY) جو مسلم اور غیر مسلم سب پر عائد ہو سکتے ہیں اور جن کی کوئی مقرر و معیّن شرح نہیں ہے !

۹۔کراءالارض : یعنی حکومت کی مملوکہ اراضی (State Lands) سے حاصل شدہ آمدنی !

۱۰۔ضرائب : وہ ٹیکس جو رفاہِ عامّہ (Public Works) کے ضمن میں یا حکومت کی وقتی اور ہنگامی ضرورتوں کے لئے صاحبِ ثروت لوگوں پر عائد کئے جائیں اُن کی بھی کوئی تعیین نہیں ہے اور حکومتِ وقت کو اُن کے ضمن میں پُورا پُورا اختیار حاصل ہے !

۱۱۔وقف : مذہبی اوقاف کی آمدنی بھی اسلامی حکومت ہی کی تحویل میں آتی ہے !

۱۲۔اموالِ فاضلہ : یعنی i) سرکاری زمینوں سے نکلنے والی معدنیات ii)۔ لاوارث شہریوں کی متروکہ جائداد یا اموال iii) کسی باغی یا مرتد کا ضبط شدہ مال iv)۔ لقطہ یعنی گری پڑی چیزیں جن کا کوئی دعویدار نہ ہو۔ v) لاوارث مقتول کی دیت کی رقوم !

دَورِ خلافتِ راشدہ کے بارے میں پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اِس میں حکومت کے مختلف شعبے جس طرح آج علیحدہ علیحدہ مدّوں میں اتنی وضاحت کے ساتھ معیّن نہ تھے گویا اِس دور

کی ریاست اور حکومت کو عہدِ جدید کے مقابلے میں درجۂ جنین (EMBRYONIC STAGE) میں قرار دیا جا سکتا ہے۔ تاہم بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس درجہ کامل جنین (FULL EMBRYO) کا ضرور تھا، اور عہدِ جدید کی جملہ ضروریات کے لئے ہمیں وہاں سے اساسی رہنمائی بہر حال مل سکتی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں پوری آبادی کا اندراج رجسٹروں میں کر لیا گیا تھا اور فوجی، تعلیمی اور دینی خدمات اور حکومت کی ذمہ داریوں کے ضمن میں وظائف کے ایک وسیع نظام کے علاوہ پوری مسلمان آبادی کے لئے انفرادی وظائف کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ اِس دَور میں ہر مسلمان کو ایک ریزرو فوجی (RESERVE SOLDIER) کی حیثیت حاصل تھی جسے کسی بھی وقت فوجی خدمات کے لئے طلب کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے لئے کاشتکاری اور زمینداری ممنوع تھی۔

بہر حال جہاں تک متذکرہ بالا ۱۲ مدّوں سے حکومتِ اسلامی کو حاصل شدہ آمدنی کے خرچ کا تعلق ہے، اُسے دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ مدّیں جن سے حاصل شدہ آمدنی کے صَرف کی مدّیں معیّن ہیں اور دوسرے وہ مدّیں جن سے حاصل شدہ آمدنی کے خرچ کی مدّیں معیّن نہیں ہیں بلکہ حسبِ ضرورت معیّن کی جا سکتی ہیں۔ معیّن مصارف سے مراد وہ "مصارفِ ثمانیہ" یعنی خرچ کی آٹھ مدّیں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ توبہ کی آیت ۶۰ میں آیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝" ترجمہ[: زکوٰۃ و صدقات حق ہیں مفلسوں کا، اور محتاجوں کا، اور زکوٰۃ و صدقات کے کام پر مقرّر کئے جانے والوں کا، اور جن کے دلوں کو نرم کرنا مقصود ہو اُن کا، اور گردنوں کے چھڑانے کے لئے (یعنی غلاموں اور مقروضوں کی رُستگاری کے لئے) اور تاوان کے بوجھ تلے آئے ہوؤں، اور اللہ کے راستے میں (جان کھپانے والوں کے لئے) اور مسافروں کا۔ یہ مقرّر و معیّن ہے اللہ کی جانب سے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور کامل حکمت والا ہے!] ——— جبکہ غیر معیّن مصارف میں دورِ جدید کی وسیع منظّم حکومت کے جملہ شعبوں (خواہ وہ سِوِل گورنمنٹ سے متعلق ہوں خواہ دفاع اور فوج سے) کے مصارف اور رفاہِ عامّہ (PUBLIC WORKS) کے جُملہ اخراجات شامل ہوں گے! ———

اسلامی حکومت کو حاصل ہونے والی کُل آمدنی میں سے عُشر، زکوٰۃ، صدقات، خُمس، اور اوقاف کی مدّوں سے حاصل ہونے والی کُل کی کُل آمدنی اور عُشور یعنی درآمدی و برآمدی DUTY میں سے

جو مسلمانوں سے حاصل ہو "مصارفِ ثمانیہ" کے لئے وقف ہیں، جبکہ بقیہ تمام مدّات سے حاصل شدہ آمدنی غیر معیّن مصارف کے لئے ہے۔

موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اب توجہ کو "مصارفِ ثمانیہ" پر مرکوز کر دیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اِن آٹھ مدّوں میں سے چھ وہ ہیں جو معاشرتی بہبود کے ذیل میں آتی ہیں یعنی فقراء، مساکین، غلاموں، مقروضوں اور مسافروں کی امداد و اعانت اور ان کاموں کے لئے متعیّن عملے کی تنخواہوں کی ادائیگی ـــــ اور بقیہ دو وہ ہیں جو اسلامی ریاست کے اصل نصب العین یعنی دنیا میں اسلام کی سربلندی کی جدّوجہد کے ذیل میں آتی ہیں یعنی جہاد فی سبیل اللہ اور تالیفِ قلب! اس ضمن میں اگرچہ کوئی نسبت و تناسب معیّن نہیں ہے تاہم بغرضِ افہام و تفہیم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی ریاست میں عُشر، زکوٰۃ، صدقات، خُمس وغیرہ ایسی عظیم مدّات سے حاصل ہونے والی خطیر آمدنی کا لگ بھگ تین چوتھائی معاشرتی بہبود کے لئے وقف کیا جا سکتا ہے۔ گویا اسلامی ریاست میں اصل معیّن آمدنی ہے ہی یا شہریوں کی دُنیوی فلاح و بہبود کے لئے جو اسلامی ریاست کے اہم ترین مقاصد میں سے ہے یا اسلام کی نشر و اشاعت اور غلبہ و استحکام کے لئے جو اسلامی ریاست کا اصل نصب العین ہے۔ اور اسلامی ریاست میں دوسرے انتظامی مصارف کے بارے میں تو خواہ مخواہ سوچ بچار کرنا پڑے۔ معاشرتی بہبود کے کاموں کے لئے وسائل کی فراہمی کے لئے ہرگز کسی تگ و دو کی حاجت نہ ہوگی بلکہ اس کے لئے ضروری فنڈ نہ ہی نہیں بلکہ وافر وسائل مسلمانوں پر اللہ کی جانب عائد شدہ عبادتوں کی بجا آوری کے ضمن میں خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ گویا معاشرتی بہبود کے کاموں کے لئے جو رقوم حاصل ہوں گی ان کے بارے میں ادا کرنے والوں کا تصوّر TAX کا نہیں ہوگا بلکہ عین عبادت کا ہوگا! ـــــ بشرطیکہ حکومت واقعی اسلامی ہو اور مسلمان مجموعی اعتبار سے حکومت اور اُس کے کارکنوں کی دیانت و امانت پر اعتماد کر سکیں! ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ معمولی شرط نہیں! خدا کرے کہ ہم جلد از جلد اس شرط کو پورا کرنے کے قابل ہو جائیں! وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً (الحدیث)

پوسٹ مارٹم، اعضا کے پیوند کاری اور خون چڑھانے کا حکم

حکومتِ اُردن کی مجلسِ افتاء کا متفقہ فیصلہ

ازقلم:- مولانا وصی مظہر صاحب ندوی (حیدرآباد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

گذشتہ دنوں ہمارے ہاں یہ مسئلہ خاصہ زیرِ بحث رہا کہ شرعاً اعضاء کی پیوند کاری جائز ہے یا نہیں؟ بعض اہلِ علم فقہی زاویۂ نظر کے بجائے اس مسئلے کو طب کے میدان میں کھینچ لے گئے۔ چنانچہ انہوں نے طبی نقطۂ نظر اس پیوند کاری کو بے مصرف قرار دینے پر اپنا سارا زور صرف کر ڈالا۔ حالانکہ ایک فقیہ تو کسی صاحبِ تدیّن تجربہ کار طبیب کی اس رائے کے بعد کہ کسی جزوِ انسانی کی صحت وسلامتی کے لئے پیوند کاری لازمی ہے، صرف فقہی نقطۂ نظر سے جواز یا عدم جواز کے مسئلہ کی تحقیق کرتا ہے!

اس موضوع پر وزارتِ اوقاف حکومتِ اُردن کی قائم کردہ مجلسِ افتاء کا ایک فتویٰ رسالہ "ھدی الاسلام" کی جلد ۲۱ کے شمارہ ۴، ۵ میں شائع ہوا ہے۔ اس فتویٰ کا ترجمہ علماء کے غور وفکر کے لئے ایک بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔ لہٰذا آپ کے مؤقر مجلّے میں بغرضِ اشاعت ارسال ہے۔

مناسب ہوگا کہ علماء اس بارے میں بھی اپنی تحقیقات سے اہلِ فکر کو آگاہ فرمائیں کہ جن چیزوں کا کھانا حرام ہے کیا اُن کا خارجی استعمال بھی حرام ہے؟ مثلاً کسی حرام جانور کی چربی کو جسم پر ملنا جب کہ اس مالش سے چربی کے بعض اجزاء جسمِ انسانی کا جزو بھی بن سکتے ہیں؟

نیز یہ مسئلہ بھی تحقیق طلب ہے کہ حرام اشیاء کو صرف نظامِ تغذیہ کے ذریعے جُزوِ بدن بنانا حرام ہے یا کسی بھی طریقہ پر (مثلاً انجکشن کے ذریعہ) اُن کو جسم میں داخل نہیں کیا جا سکتا؟ پہلی صورت میں حرام اشیاء کا طلاءً استعمال بھی حرام ٹھہرے گا، اور دوسری صورت میں اعضاء کی پیوند کاری یا خون کو جسم میں داخل کرنا حرام شے کے استعمال کی تعریف سے خارج قرار پائیں گے۔ والسلام

وصی مظہر ندوی مہتمم مدرسہ جامعہ اسلامیہ حیدرآباد

اصل زیرِ غور مسئلہ!

سوال: پوسٹ مارٹم، کسی مردہ یا زندہ انسان کا عضو کسی دوسرے شخص میں، اس کی زندگی بچانے یا اس کے اعضاء کو سلامت رکھنے کے لئے منتقل کرنے یا کسی زندہ انسان کا خون دوسرے انسان میں داخل کرنے کا شرعی حکم کیا ہے؟

جواب: سوال میں مذکور مسائل ان نئے معاملات میں سے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد ہمارے سلف صالحین کے زمانے میں موجود و معلوم نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان جیسے معاملات کے بارے میں کوئی متعین حکم منقول نہیں ہے۔ چنانچہ کتاب اللہ اور سُنّت میں کوئی ایسی نص موجود ہے جو اعضاء کی منتقلی کو جائز کرتی ہو اور نہ ایسی نص موجود ہے جو اس سے منع کرتی ہو۔ لہٰذا اِن مسائل کا حکم شریعت کی عمومی ہدایات اور دلائل ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

مملکتِ اُردنیہ ہاشمیہ کی مجلسِ افتاء کی رائے یہ ہے کہ سوال میں مذکور اُمور یعنی پوسٹ مارٹم، اعضاء اور خون کی منتقلی شرعاً جائز ہیں۔ اس رائے کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

اوّلاً یہ کہ: علماء کے نزدیک چونکہ انسانی جان کی حفاظت واجب ہے، لہٰذا ایک مسلمان کی زندگی کو بچانے یا اُس کے کسی عضو کو سلامت رکھنے کے لئے کسی زندہ یا مردہ کے عضو کا منتقل کرنا اگر ضروری ہو جائے تو اس پیوند کاری کو ضرورتاً جائز تصوّر کیا جائے گا۔[1]

---

[1] محض کسی عضو کی سلامتی کے لئے دوسرے کے عضو کی منتقلی کیلئے فتویٰ میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ البتہ ایسے اعضاء جن پر زندگی کا دار و مدار ہے ان کی منتقلی کے جواز کیلئے "انسانی جان کی حفاظت کے وجوب!" سے استدلال کیا جا سکتا ہے! (مُترجِم)

ثانیاً یہ کہ : رُوحِ شریعت اوراس کے عمومی قواعد بھی اس جواز کا تقاضا کرتے ہیں مثلاً درج ذیل عمومی قواعد :

i- "ضرورت" ممنوع شے کو جائز کر دیتی ہے ! (الضرورات تبیح المحظورات)

ii- "ضرورت" کو بس بقدرِ ضرورت تسلیم کیا جائے گا ! (الضرورات تقدر بقدرها)

iii- "ضرورت" کے لئے مخصوص احکام ہیں !. (الضرورة احکام)

iv- جب کوئی معاملہ تنگی کا موجب بنتا ہے تو اس میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ (اذا ضاق الامر اتسع)

v- مشقّت سہولت پیدا کرنے کو لازم ٹھہراتی ہے (المشقّة توجب التیسیر)

vi- کم تر نقصان (برائی) کو گوارا کر لینا قابل اعتراض نہیں ! (ارتکاب اخف الضررین)

ثالثاً یہ کہ : قتل کا پتہ چلانے کے لئے یا کسی مرض کی حقیقت معلوم کرکے، اس مرض میں گرفتار دوسرے مریضوں کا علاج کرنے کے لئے۔ اسی طرح ایسی تمام صورتوں میں جبکہ کوئی عمومی یا مخصوص فائدہ حاصل ہوسکتا ہو، عُلماءِ متقدّمین و متأخرین نے مردہ شخص کے پوسٹ مارٹم کو جائز قرار دیا ہے۔

نیز فقہاءِ حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ سب نے وفات پا جانے والی ماں کے پیٹ میں سے زندہ بچے کو یا مرنے والے کے پیٹ میں موجود کسی قیمتی شے کو نکالنے کے لئے، پیٹ چاک کرنے کی اجازت دی ہے۔

ظاہر کہ جب علماء نے نگلے ہوئے مال کو جس کی مقدار نصاب زکوٰۃ یا نصابِ سرقہ (یعنی محض ربع دینار یا تین درہم) کے برابر ہو، نکالنے کے لئے پیٹ چاک کرنے کی اجازت دی ہے تو پھر جان بچانے یا کسی عضو کی سلامتی یا کسی جرم کا پتہ چلانے کے لئے پوسٹ مارٹم بدرجۂ اولیٰ جائز ہونا چاہیے۔

اِس سلسلہ میں فقہاء کی عبارتیں ملاحظہ ہوں :

(الف) ردّ المختار علی الدر المختار میں' جو احناف کی معتمد علیہ کتب میں سے ہے لکھا ہے کہ :

حامل ماتت وولدها یضطرب	حاملہ عورت مرگئی، اس کا بچہ پیٹ میں زندہ

ای فی بطنہا، یشق بطنہا من
الایسرو یخرج ولدھا ولو
بالعکس وخیف علی الامام
ای من الھلاک قطع، ای
الجنین، واخرج ولو میتاً
ولو بلغ مال غیرہ ومات ھل
یشق ام لا؟ قولان! الاوّل
نعم! (ج ۱ ص ۶۰۴)

حاملہ عورت مرگئی، اُس کا بچہ پیٹ میں زندہ
متحرک ہے تو اس کا پیٹ بائیں جانب سے
چاک کیا جائے گا اور بچہ کو نکال لیا جائے گا۔
اور اگر کسی نے غیر کا مال نگل لیا ہو اور پھر مرگیا
ہو تو کیا اس کا پیٹ چاک کیا جائے گا؟ اس
کے بارے میں دو قول ہیں۔ پہلا قول یہ ہے
کہ ہاں! (اس کا پیٹ چاک کیا جائے گا!)

(ب) مالکیہ کی کتابوں میں "متنِ خلیل" کی کتاب الجنائز میں لکھا ہے:

بقرعن مال کثر تبت بالبینة
او بشاھد ویمین قال الخرشی
فی شرحہ والحطاب ج ۲۔ آخر
کتاب الجنائز (البقر عبارۃ عن
شق جوف المیت) یعنی ان من
ابتلع مالا لہ او لغیرہ ثم مات
فانہ یشق جوفہ فیخرج
منہ ان کان لہ قدر ذو بال
بان یکون نصابا) ای کنصاب
الزکوٰۃ، وقیل کنصاب السرقۃ
ای ربع دینار وھو ما یساوی
ثلاثۃ دراھم، ثم اورد مسألۃ
شق بطن الحامل التی ماتت
وفی بطنہا جنین حیّ وذکر بان
بعض ائمۃ المذھب منع
شق بطن الحامل فی ھٰذہ الحال

(مردہ کا) پیٹ چاک کر کے ایسے مال کو نکالا
جائے گا جو زیادہ ہو اور پیٹ میں جس کی
موجودگی دو گواہوں یا ایک گواہ اور قسم سے
معلوم ہوئی ہو۔ خرشی نے اپنی شرح میں اور
الحطاب نے ج ۲ کتاب الجنائز کے آخر میں
البقر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس
سے مراد مردہ کا پیٹ چاک کرنا ہے۔ مطلب
یہ ہے کہ اگر کسی نے اپنا یا پرایا مال نگل
لیا، پھر مرگیا تو پیٹ چاک کر کے مال نکالا
جائے گا۔ بشرطیکہ وہ قابلِ لحاظ مقدار مثلاً
کسی نصاب کے برابر ہو، یعنی زکوٰۃ کے
نصاب کے برابر اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرقہ
کے نصاب یعنی ¼ دینار جو تین درہم کے
مساوی ہوتا ہے، کے برابر ہو۔ اس کے بعد
انہوں نے اس حاملہ کے پیٹ کے چاک کرنے
کا مسئلہ کا ذکر کیا ہے، جس کے پیٹ میں

وبقية ائمة المالكية اجازوا ذٰلك

زندہ بچّہ ہو، اور یہ بتایا ہے مالکی فقہ کے بعض ائمہ نے تو اس کو ناجائز بتایا ہے جبکہ باقی مالکی ائمہ نے اسے جائز قرار دیا ہے۔

(ج) "المهذب" جو شوافع کی معتمد کتب میں سے ہے، اس کی کتاب الجنائز ج ۱ صـ ۱۳۸ پر لکھا ہے:

وان ابتلع الميت جوهرة لغيرة وطالب وصاحبها بها شق جوفه وردت الجوهرة

اور اگر مرنے والے نے کسی دوسرے شخص کا کوئی قیمتی پتھر نگلا تھا پھر مرگیا۔ اگر اس پتھر کا مالک واپسی کا مطالبہ کرے تو مرنے والے کا پیٹ چاک کر کے پتھر نکال کر مالک کو واپس لوٹایا جائے گا۔

اسی کتاب میں مزید لکھا ہے:

وان ماتت امرأة وفي جوفها جنين حيٌ شق جوفها لانه استبقاء حي باتلاف جزء من الميّت فاشبه اذا اضطر الى اكل جزء من الميّت۔

اور اگر کوئی عورت مرجائے اور اس کے پیٹ میں زندہ بچّہ موجود ہو تو اس کا پیٹ چاک کیا جائے گا۔ کیونکہ یہ ایک زندہ ہستی کو مردہ کے ایک جزء کو ضائع کر کے بچانا ہے یہ صورت ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص اپنی جان بچانے کے لئے کسی مردہ کا کوئی حصّہ کھانے پر مجبور ہوجائے[1]۔

(د) ابن قدامہ حنبلی نے اپنی مشہور کتاب "المغنی" میں لکھا ہے:

وان بلع الميّت مالاً فانه

کسی مرنے والے نے کوئی مال نگل لیا اگر وہ

---

[1] فتویٰ میں فقہاء کے جتنے اقوال کو نقل کیا گیا۔ اس میں صرف مرنے والے جسم کی بے حرمتی کو ضرورتاً جائز کیا گیا ہے۔ پوسٹ مارٹم کے جواز کے لئے یہ جزئیات دلیل بن سکتی ہیں لیکن کوئی زندہ شخص کسی حرام شئے (دوسرے انسان کا خون یا اعضاء) کو استعمال کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب متن میں درج کردہ متفقہ علیہ مسئلے (جان بچانے کے لئے حرام شئے کے استعمال کے جواز) کی روشنی میں یہ ہے کہ جان بچانے کے لئے ان حرام اشیاء کو استعمال کر سکتا ہے۔ لیکن محض سلامتی اعضاء (خصوصاً وہ اعضاء جن پر زندگی کا دارومدار نہیں ہے؟) کے لئے تبدیلی کے جواز کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے! (مترجم)

كان يسيرًا وان كثرت قيمته شق بطنه واخرج لان فيه حفظ المال من الضياع ونفع الورثة الذين تعلق حقهم بماله بمرضه - اى بمرض موته - (ج ۲ ص ۴۵۹)

معمولی مقدار میں ہے تو اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ لیکن اگر اس کی قیمت زیادہ ہے تو اس کا پیٹ چاک کرکے اس کو نکالا جائے گا کیونکہ یہ مال کو ضائع ہونے سے بچانا اور ان وارثوں کو فائدہ پہنچانا ہے۔ جن کا حق مرنے والے کے مرض الموت کے باعث اس کے مال سے متعلق ہو چکا ہے ؛

ہمارے اس فتویٰ کی مخالفت میں یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ بعض دلائل سے پوسٹ مارٹم یا کسی مردہ شخص کے کسی عضو کو زندہ کے جسم میں منتقل کرنے کا عدم جواز ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً یہ دلیل کہ اسلامی شریعت نے انسان کو محترم قرار دیا ہے اور اس کے احترام کو مجروح کرنے والے امور سے منع کیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے :۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (آیت ۷۰، سورۂ بنی اسرائیل) : "یقیناً ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی ہے"۔ نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اس کو ابوداؤد نے مسلم کے شرائط کے مطابق اور نسائی نے حضرت عائشہؓ سے روایت کیا ہے : كسر عظم الميت ككسر عظم الحي : "مردہ کے جسم کی ہڈی توڑنا زندہ کی ہڈی توڑنے جیسا ہی ہے۔ (آپ کی مراد حرمت میں مماثلت سے ہے!)"۔ اسی طرح ابن مسعودؓ کی وہ روایت ہے جس کو ابن ابی شیبہ نے نقل کیا ہے : اذى المؤمن فى موته كاذاه فى حياته : "مومن کو مرنے پر ایذا دینا ایسا ہی ہے جیسے اس کو زندگی میں ایذا دی جائے"

ان دلائل سے استدلال اس لئے درست نہیں کہ مذکورۃ الصدر آیت کریمہ اور دونوں حدیثوں کا مقصد میت کے احترام کی تاکید ہے اور اُس کی اہانت یا مثلہ بنانے سے اجتناب پر زور دینا ہے۔ چنانچہ ہڈی توڑنے سے منع کرنے والی حدیث جس واقعہ سے متعلق ہے، اُس سے بھی ہمارے نقطۂ نظر کی تاکید ہوتی ہے۔ واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کھدائی کرنے والے کو دیکھا کہ وہ کسی جائز شرعی ضرورت کے بغیر میت کی ہڈی توڑ رہا ہے، تو آپ نے اس کو مخاطب کرکے فرمایا : "مردہ کی ہڈی توڑنا، زندہ کی ہڈی توڑنے ہی جیسا ہے"

لیکن ہم جس مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں، اس کا تعلق امانت سے نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تو مسئلہ ایک انسان کی زندگی بچانے یا اُس کے عضو کی سلامتی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم علماء نے دونوں صورتوں میں واضح امتیاز کے صحیح فہم وشعور کی بنا پر کسی بھی مشروع مقصود مثلاً کسی قیمتی شے کو یا زندہ بچّہ کو نکالنے کی غرض سے پیٹ چاک کرنے کو جائز ٹھہرایا ہے۔

ان تمام تفصیلات کے پہلو بہ پہلو مجلس افتاء واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اعضاء کی پیوندکاری اور پوسٹ مارٹم کا جواز درج ذیل شرائط کے ساتھ مشروط ہے کیونکہ اُن کے بغیر احترام میّت کے اسلامی آداب کی پابندی ممکن نہیں۔ نیز اپنی شرائط کے ذریعہ بے مقصد تصرّف اور اہانت آمیز اقدامات سے روکا جا سکتا ہے۔

(۱) جو شخص اپنی زندگی میں اپنے کسی عضو یا اعضاء کو اپنے مرنے کے بعد کسی دوسرے کو دینے پر رضامند ہو اس کی جانب سے تحریری منظوری پھر مرنے کے بعد اس کے والدین میں کسی ایک یا اس کے سرپرست کی اور نامعلوم شخصیّت ہونے کی صورت میں مسلمان حاکم کی منظوری۔

(۲) جس کو عضو دیا جا رہا ہو وہ اس عضو کا ضرورت مند ہو یا اس کے حصول کیلئے مضطر ہو اور یہ کہ اس کی زندگی یا جسم کے کسی نظام کی سلامتی اس عضو پر موقوف ہو نیز مذکورہ بالا ضرورت اور اضطرار کی تصدیق کسی ایسے بورڈ کی جانب سے ہونی چاہیئے۔ جس کے تدیّن، علم اور تجربہ پر اعتماد کیا جا سکے۔

(۳) جس کا عضو یا خوف حاصل کیا جا رہا ہو وہ اگر بقید حیات ہو تو کسی ایسے عضو کو منتقل کرنا جائز نہ ہوگا جو زندگی کے لئے بنیادی اہمیّت کا حامل ہو[1]۔ اور جس کے باعث خود عضو دینے والے کی زندگی خطرہ میں پڑ جائے، خواہ عضو کی ایسی منتقلی کے متعلق شخص کی رضامندی ہی سے کیوں نہ کی جا رہی ہو۔

---

[1] اگر زندہ انسان کا عضو جو زندگی کے لئے بنیادی اہمیّت کا حامل ہو اسے منتقل کرنا جائز نہیں تو پھر یوں کہنا چاہیئے کہ زندہ انسان کا کوئی عضو منتقل کرنا جائز نہیں کیونکہ پیوندکاری کے جواز کے لئے یہ شرط پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ اسی عضو کی پیوندکاری جائز ہے جس عضو پر زندگی یا جسم کے کسی نظام کی سلامتی موقوف ہو۔

(۴) عضو کی اس منتقلی سے عضو دینے والے شخص کے جسم میں کوئی غیر معمولی بدنمائی پیدا نہ ہو۔

(۵) عضو کی یہ تبدیلی یا خون کا عطیہ محض رضا کارانہ ہو اس کے بدلے کوئی مادّی معاوضہ نہ لیا جائے، اور نہ کوئی دوسرا مادّی فائدہ پیشِ نظر ہو۔

مزید برآں "مجلسِ افتاء" اس امر کی یاد دہانی کرانا اپنا فرض تصوّر کرتی ہے، کہ بوسیلے مارہم، اعضاء کی پیوند کاری اور خون کی منتقلی میں بے حد احتیاط برتنی چاہیے سہل انگاری کے ساتھ اس کے دائرے کو وسیع تر کرتے چلے جانا قطعاً غلط ہے اس کے بجائے اس عمل کو بس "ضرورت" کی حد تک محدود رکھنا چاہیے کیونکہ جواز کی علّت "ضرورت" ہے لہٰذا جواز اور عدم جواز "ضرورت" کی موجودگی یا عدم موجودگی پر موقوف ہیں۔ جو ڈاکٹر یا اطبّاء اس کام کے نگران ہوں، اُن کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنا چاہیے جو نہایت باریک بین ہے اور جس کی قدرت ہمہ گیر ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی صحیح رہنمائی فرمائے۔ آمین

مجلسِ افتاء

محمّد عبدہٗ هاشم	محمّد ابو سردانہ
عزیز الدّین الخطیب	اسعد بیوض التمیمی
ابراهیم زید الکیلانی	عبد السّلام العبادی

یٰسین درادکة

اِنْ شَاءَ اللّٰهُ الْعَزِیْز

ماهنامہ 'میثاق' لاهور کا آئندہ شمارہ

قرآن کانفرنس نمبر ہوگا

جس میں پانچویں سالانہ قرآن کانفرنس منعقدہ کراچی (۲۳ تا ۲۵/ مارچ ۸۷ء) میں پیش کردہ مقالات اور خطابات شامل ہوں گے۔ یہ شمارہ نومبر۔ دسمبر ۸۷ء کا مشترکہ شمارہ ہوگا اور وسطِ دسمبر ۸۷ء تک منصّۂ شہود پر آجائے گا۔ (ج - ر)

تحقیق در مسئلۂ تناسخ

از قلم: غازی عزیر، محلہ شیخاں، اپر فورٹ، علی گڑھ (بھارت)

اہلِ اسلام کا ایمان ہے کہ ایک دن اس کائنات کی تمام چیزیں فنا ہو جائیں گی کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔ اس کے بعد یوم الآخرت کو خدائے تبارک و تعالیٰ ہر کسی کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ اُن کے اعمال کا حساب لے گا۔ اچھائیوں کی جزا اور بُرائیوں کی سزا دے گا۔ مگر بعض دوسرے مذاہب کے پیروؤں کا عقیدہ اِس کے برخلاف یہ ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اُس کی رُوح اِسی دُنیا میں اپنی پچھلی زندگی میں کئے گئے اچھے یا بُرے اعمال کی جزا یا سزا پاتی ہے۔ عموماً مشہور ہے کہ تناسخ کا عقیدہ صرف ہندوستان یا صرف ہندو قوم ہی میں پایا جاتا ہے۔ لیکن تحقیق سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا کی بہت سی اقوام تناسخ کی قائل ہیں اور یہ عقیدہ دنیا کے بہت سے خطوں میں پایا جاتا ہے۔

بعد از تلاشِ بسیار معلوم ہوتا ہے کہ اس عقیدہ کی ابتدا ہندوستان میں یا ہندوستان سے باہر کوئی زمانۂ قریب میں نہیں ہوئی، بلکہ زمانۂ قدیم سے ہے۔ اس عقیدہ کی قدامت کا اندازہ امام حافظ جمال الدّین ابو الفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزیؒ (المتوفّی ۵۹۷ھ) کی اس تحقیق سے بخوبی کیا جا سکتا ہے: "یہ مذہب زمانۂ فرعون و موسیٰؑ سے ظاہر ہوا ہے!" (تلبیسِ ابلیس صفحہ ۱۰۵)۔

تناسخ کی تعریف آسان الفاظ میں اس طرح کی جا سکتی ہے: "نیکوں کی رُوحیں جب بدن سے نکلتی ہیں تو اچھے بدن میں داخل ہوتی ہیں، پس مال و دولت سے عیش کرتی ہیں اور بدکاروں کی رُوحیں جب نکلتی ہیں تو بُرے اجسام میں داخل ہوتی ہیں تو اُن پر سختیاں ڈالی جاتی ہیں۔" (تلبیسِ ابلیس صفحہ ۱۰۵)

اس عقیدہ کو بعض اقوام نے جن وجوہ پر اختیار کیا ہے اس کی تفصیل ابو القاسم البلخی اس طرح بیان فرماتے ہیں: "جب انہوں نے دیکھا کہ بچوں، درندوں اور جانوروں کو دُکھ حاصل ہوتا ہے تو اُن کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہ آئی کہ اُن کے دکھ سے غیروں کا امتحان

کیا جائے یا اُن کو ثواب و عوض دیا جائے یا کسی غیر معنی سے ہو، سوائے اتنی بات کے کہ یہ چیزیں مملوک ہیں تو انہوں نے اپنے زعم میں یہ صحیح سمجھا کہ اس حالت سے پہلے اُن سے کچھ گناہ سرزد ہوئے جن کی یہ سزا ہے۔ (تلبیسِ ابلیس ص ۱۰۶،۱۰۵)

ابو الحسن علی بن نظیف المتکلم نے امام ابن الجوزیؒ واعظِ بغداد سے چھٹی صدی ہجری کا تناسخ کا ایک واقعہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

"بغداد میں ہمارے پاس فرقۂ امامیہ کا ایک پیشوا جس کو ابوبکر بن الفلاس کہتے تھے آیا کرتا تھا۔ اُس نے ہم سے بیان کیا کہ میں ایک شخص کے پاس جایا کرتا تھا، جس کو میں شیعہ جانتا تھا۔ ایک مدت کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ تناسخ کا قائل ہو گیا۔ چنانچہ ایک روز میں نے دیکھا کہ اس کے سامنے ایک سیاہ بلّی بیٹھی ہے، وہ اس کو پیار کرتا اور اُس پر ہاتھ پھیرتا اور اُس کا سر اور آنکھیں سہلاتا اور بلّی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں، جیسے عموماً بلّیوں کی عادت ایسی حالت میں ہوتی ہے اور وہ شخص بہت روتا ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ آپ کیوں روتے ہیں۔ اُس نے کہا کہ واہ کیا تجھے یہ بھی نظر آتا ہے کہ جس قدر میں اس پر ہاتھ پھیرتا ہوں یہ روتی ہے۔ یہ بلاشک میری ماں ہے اور مجھے دیکھ کر حسرت سے روتی ہے اور اُس بلّی سے اس طرح باتیں کرنے لگا جیسے کوئی اپنے نزدیک سمجھدار سے باتیں کرتا ہے۔ بلّی نے آہستہ آہستہ میاؤں میاؤں کرنا شروع کیا۔ میں نے کہا کہ تم جو کچھ کہتے ہو یہ سمجھتی ہے؟ کہنے لگا کہ ہاں! میں نے کہا کہ تم بھی اس کی بولی سمجھتے ہو؟ کہا کہ نہیں! میں نے کہا کہ پھر تو تجھ میں تناسخ ہوا اور وہ (بلّی) انسان ہے!" تلبیسِ ابلیس ص ۱۰۵، ص ۱۰۶۔

امام ابن الجوزیؒ یحییٰ بن بشر بن عمیر النہاوندی سے ہندوؤں میں تناسخ کے عقیدہ کی کیفیت کو اس طرح نقل کرتے ہیں:

"ہندو کہتے ہیں کہ طبیعتیں چار ہیں۔ (۱) مادہ مرکبہ (۲) نفس (۳) عقل (۴) مادہ مطلقہ میں مادہ مطلقہ چھوٹا رب ہے۔ نفس مادۂ اصغر ہے، عقل ربِّ اکبر (بڑا) ہے اور وہی مادۂ اکبر بھی ہے۔ نفوس جب دنیا چھوڑتے ہیں تو چھوٹے رب کے پاس جاتے ہیں اور وہی مادۂ مرکبہ ہے۔ پس اگر یہ نفس نیک اور صاف ہو تو وہ اُس کو اپنی طبیعت میں قبول کرتا ہے۔ پھر اُس کو صاف کرکے مادۂ اصغر کے یہاں نکالتا ہے اور وہ نفس ہے یہاں تک کہ

وہ ربِّ اکبر کے یہاں جاتا ہے ..... پھر وہ اُس کو مادۂ اکبر کے یہاں بھیجتا ہے۔ پھر اگر وہ نیکی میں پورا تھا تو عالمِ بسیط میں اُس کے پاس رہتا ہے۔ اور اگر وہ نیکی میں پورا نہ ہوا تو وہ دوبارہ ربِّ اکبر کے پاس واپس کرتا ہے۔ پھر ربِّ اکبر اس کو مادۂ اصغر کے پاس بھیجتا ہے۔ پھر مادۂ اصغر اس کو رب کے پاس پھیر دیتا ہے، تو وہ اس کو نورِ انیّت سے مخلوط نکالتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسا ساگ کر دیتا ہے جس کو آدمی کھاتے ہیں تو وہ انسان کی صورت میں بدل جاتا ہے۔ اور دوبارہ عالم میں پیدا ہوتا ہے، اور یہی حال اس کا ہر موت کے وقت ہو جاتا ہے، جب وہ یہاں مرتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو بدکردار ہیں تو ان کے نفوس جب مادۂ اصغر کے پاس بھیجے جاتے ہیں تو الٹ کر گھاس ہو جاتے ہیں، لیکن ایسی گھاس پات جس کو جانور کھاتے ہیں، تو اس کی روح کسی جانور کی صورت میں جاتی ہے پھر اس جانور کے مرنے پر کسی دوسرے جانور کے اندر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ہمیشہ تناسخ سے صورتوں میں پھرتی رہتی ہے اور ہر ہزار برس کے بعد انسانی صورت میں پھر جاتی ہے۔ پھر اگر اس نے انسانی صورت میں نیکی اختیار کی تو نیکیوں میں مل جاتی ہے!" (تلبیس ابلیس صفحہ ۱۰۶)

مولانا عبدالحق صاحب تناسخ کی ہندو مذہب میں تعریف اس طرح فرماتے ہیں: "جس وقت کوئی گنہگار مرتا ہے تو جم راج جس کو ہندو دھرم رائے بھی کہا کرتے ہیں۔ اُس کے سپاہی گنہگار کی روح کو جم راج کے پاس لے جاتے ہیں۔ جم راج اُس کے عملوں کا حساب لیتا ہے، پھر وہ جس سزا کے لائق ہوتا ہے، اُس کو ویسا ہی جسم اور ملتا ہے، اُس جسم میں اپنے اعمال کی سزا پاکر اُس جسم سے نکل کر پھر کسی اور جسم میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح ہزارہا جنم لیتا ہے اور حسب الحال ہر طرح کے حیوان کے جنم لیتا ہے یہاں تک کہ مکھی اور بھڑ اور سوٴر اور کتا وغیرہ حیوانات بلکہ کبھی درخت بھی ہو جاتا ہے اور بعضے ہندو کہتے ہیں کہ پتھر بھی ہو جاتا ہے اور بہت سے جنم لے کر اور اعمال کی سزا پا کر جب گناہوں سے صاف ہوتا ہے تب اس کی مکھش یعنی نجات ہوتی ہے اور موکھش یہ ہے کہ نیست و نابود ہو کر خدا کی ذات میں مل جاتا ہے۔ اور کبھی گناہوں کی شامت سے نرگ یعنی دوزخ میں جا کر اور وہاں سے نکل کر کبھی پھر جنم لیتا ہے!" (تحفۃ الہند صفحہ ۵)

کرم بپاک جو ہندو مذہب کی ایک معتبر کتاب ہے اس میں انسانی روح کی نجات

تک تناسخ کے مدارج اس طرح بیان کئے گئے ہیں:

"جو کوئی ملیچھ (برہمن کے علاوہ تمام دوسری ذاتیں ملیچھ ہیں!) اپنی عمر میں اچھے کام کرے تو وہ بعد مرنے کے شودر ہوتا ہے، اور جو کوئی شودر اپنے طریق پر ثابت رہا ہو اور اچھے کام کرے تو مرکر بیش (ذات) ہوتا ہے، اور جو بیش اچھے عمل کرے اور اپنے طریق پر قائم رہے تو وہ بعد مرنے کے کھتری (ذات) ہوتا ہے۔ اور کھتری اچھے عمل کرے تو بعد مرنے کے برہمن کا جنم لیتا ہے اور برہمن اچھے عمل کرے تو اس کی موکھش یعنی نجات ہوتی ہے!" (کرم بیاک بحوالہ تحفۃ الہند صـ۵۰)

ہندوؤں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ: "جب کوئی اچھا آدمی مرتا ہے تو وہ جس دیوتا کی عبادت کرتا تھا بعد مرنے کے اسی دیوتا کے مقام میں جاتا ہے!" (تحفۃ الہند صـ۵۰) وہ روح جس کو نجات مل گئی یا بالفاظِ دیگر وہ اس دیوتا کے مقام میں چلی گئی جس کی وہ عبادت کرتا تھا، پھر بھی اس کو (روح کو) قرار نصیب نہیں ہوتا۔ وہاں یعنی بہشت میں بھی اس کے اعمال و افعال پر نظر رکھی جاتی ہے، جیسا کہ مولانا عبدالحق صاحب لکھتے ہیں:

"جو کوئی بہشت میں گناہ کرے اس کی بھی سزا ملتی ہے!" (تحفۃ الہند صـ۵۰) چنانچہ مہابھارت کے اوپروب میں لکھا ہے کہ: "واجاجات نے بہشت میں کہا کہ میں اپنے برابر کسی کو نہیں جانتا۔ اندر نے اس گناہ کے بدلے اس کو بہشت سے دنیا میں پھینک دیا، پھر اس گناہ سے پاک ہو کے بہشت میں گیا!" (اپروب مہابھارت بحوالہ تحفۃ الہند صـ۵۱)۔ اسی قسم کا ایک دوسرا واقعہ بھی مہابھارت کے اوپروب میں ملتا ہے:۔

"ایک راجہ نیک کردار بہشت میں داخل ہوا۔ ایک روز گنگا برہما کے پاس گئی وہ راجا بھی وہاں حاضر تھا۔ ہوا نے گنگا کا دامن اٹھا دیا۔ راجا کی نظر گنگا کے رانوں پر پڑی عاشق ہو گیا۔ اس گناہ کی شامت سے بہشت سے نکالا گیا!" (اوپروب مہابھارت بحوالہ تحفۃ الہند صـ۵۱)

ہندوؤں کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص کو نجات مل گئی اور وہ بہشت میں داخل ہو گیا، اور وہاں بھی اس کے اعمال بہتر رہے تب بھی وہ صرف ایک مدت تک ہی بہشت میں رہے گا، اور اس مدت کے بعد اس کو دوبارہ دنیا میں آزمائش کے لئے بھیج دیا جائے گا: "جب کوئی شخص سرگ میں داخل ہوتا ہے تو بعد مدت مقررہ

کے وہاں سے نکل کر پھر جنم لیتا ہے!" (تحفۃ الہند ص۵)۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ روح قدیم ہے جو تناسخ کے مختلف مدارج سے بار بار گزر رہی ہے۔ ہندو مذہب کی ایک معتبر کتاب میں اس طرح لکھا ہے: "آں آتما از ہمہ دہر قدیمی قدیم تر است! الخ (پنکھٹ اتھربن بید ص۱۱۹ بحوالہ تحفۃ الہند ص۲۴)۔ اسی بات کو ایک دوسری جگہ اس طرح لکھا ہوا ہے: "از آں ذاتِ قدیم ہمہ ارواح ظاہر می شود و در ہمہ مردے مرد اند!" (منڈوک اپنکہت اتھربن بید بحوالہ تحفۃ الہند ص۲۴)

ہندوؤں کی تمام قدیم مذہبی کُتب میں قدامتِ رُوح اور تناسخ کا ذکر ملتا ہے مثلاً اندرمن کہتا ہے کہ اصل الاصول ملل شاستر یکے ست و آں اعتقاد بر بید ست کہ کلامِ الٰہی قدیم است و در ہر زبان از نسخ و تحریف سیر او اصول مذہبِ شاستراں چہار اند، اوّل اقرارِ توحیدِ الٰہی الخ دُوُم اقرار بقدامتِ رُوح، سوّم اقرارِ تناسخ چہارم ایں کہ حصولِ نجات از جہان گذران لعلم ذات وصفات او تعالیٰ می گردد (انتہیٰ مختصراً۔ (باب دوم سوط الجبار ص۱۵۴ تا ص۱۵۷) آخر اس تناسخ سے کبھی رُوح کو نجات بھی ملتی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب بھی ہم کو بعض کتبِ معتبرہ میں مل جاتا ہے: "انسان چوراسی لاکھ جنم سے نہیں چھوٹتا کبھی کیڑا کبھی جوک کبھی گھاس بوئے وغیرہ جنم پاتا ہے لیکن ایک دفعہ ننگ تروجن مہادیو کا کر کے جنم لینے سے چھوٹ جاتا ہے۔ انتہیٰ مختصراً (اسکندھ پوران ادھیائے ع۵۷ بحوالہ سوط الجبار ص۴۱)۔ اسی کتاب میں مزید لکھا ہے کہ: "آٹھ ہزار جنم کے گناہ سے ایک دیدار بھیروں ناتھ سے پاک ہوتا ہے!" انتہیٰ مختصراً (اسکندھ پوران ادھیائے ع۳۱ بحوالہ سوط الجبار ص۵۶)

بعض ہندو مذہب کی کتاب معتبرہ میں یہاں تک لکھا ہے کہ: "ہم کتانی ملک الموت سے کہا کہ کوئی کہتا ہے رُوح مثل اور قوّتوں کے جسم کے ساتھ مر جاتی ہے کوئی کہتا ہے سبب اعمال اور مکان باقی ہے، اصل اس کی کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کی کیفیت داجبی بر سماپتی مہیش بھی نہیں جانتے۔ بھکتا نے کہا تم ہی اپنی رائے سے فرماؤ کہ اور کچھ درکار ہو طلب کر یہ مت پوچھ کہ بعد مرنے کے کیا ہوتا ہے، اُس کا کہنا اور سمجھنا مشکل ہے۔ کوئی مر کے زندہ ہوتا تو داجبی کہتا جو معلوم ہی نہیں وہ کیا کہوں۔ انتہیٰ مختصراً!" (کھوٹلی اپنکھنڈ اتھربن بید بحوالہ سوط الجبار ص۸۸)

عقیدہ تناسخ نہ صرف درایت کے لحاظ سے ساقط الاعتبار ہے بلکہ علمی (SCIE NTIFIC) لحاظ سے بھی باطل اور ناقابلِ یقین ہے۔ اس مسئلہ کی حقیقت مفکرینِ اسلام نے خوب سمجھی ہے، جن میں سے چند کے اقوال ذیل میں پیش ہیں۔ تناسخ کے بارے میں مولانا عبدالحق صاحب کی تحقیق ہے کہ "تناسخ کا مسئلہ محض خیال بندی ہے!" (تحفۃ الھند حاشیہ صفحہ)۔ امام حافظ جمال الدین ابوالفرج عبدالرحمٰن ابن الجوزی حنبلی بغدادیؒ اسے صرف شیطان کی فریب کاری بتاتے ہیں: ابلیس نے بعض اقوام پر تلبیس کی وہ لوگ آواگون کے قائل ہوگئے! (تلبیسِ ابلیس صفحہ ۱۰۵)۔ اسی کتاب میں امام موصوف آگے لکھتے ہیں:۔ "دیکھو ان گمراہوں کے واسطے کس طرح ابلیس نے یہ تلبیسات ترتیب دے کر ان پر ڈالی ہیں کہ بغیر کسی دلیل مستند کے انہوں نے یہ تلبیسات قبول کرلیں۔ حالانکہ عقلی و نقلی سب طرح دلیلوں سے یہ مذہب باطل ہے!" (تلبیسِ ابلیس صفحہ ۱۰۶)

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس مرنے والے کے اس دنیا اور اس کے متعلقات سے سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ اس کا جسم مادہ ضعیف ہونے کی بنا پر سڑ گل کر اجزائے متفرقہ کی شکل میں زمین کی تہہ میں متفرق ہوجاتا ہے۔ اس کی رُوح عالمِ برزخ میں رہتی ہے۔ یہی بات قرآن فرماتا ہے: وَمِنْ وَّرَائِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ (المومنون آیت ۱۰۰) "یعنی سب (مرنے والوں) کے پیچھے ایک برزخ (آڑ) حائل ہے دوسری زندگی کے دن تک!"۔

اس قرآنی آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد روح اس دنیا میں مختلف جسموں میں نہیں قرار پاتی بلکہ عالمِ برزخ میں مکان پاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس مرنے والے کی رُوح کو قیامت کے روز تک اس کے اعمال کے بدلے وہیں (عالمِ برزخ میں) عذاب یا راحت کی کیفیات میں مبتلا رکھا جاتا ہے نہ کہ اس دنیا میں: "عذاب و راحت کے جو بھی احوال مرنے والے پر گذرتے ہیں، وہ عالمِ برزخ میں گذرتے ہیں اس دنیا میں نہیں!" ("یہ قبریں یہ آستانے!" از دکتور المسعود الدین العثمانی)۔

قرآنِ کریم میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ (سورۃ النحل آیت ۲۱) "یعنی مردے ہیں نہ کہ زندہ!"۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝ (سورۃ النحل آیت ۲۱) یعنی: "اور اُن کو یہ تک معلوم نہیں کہ انہیں کب

(دوبارہ زندہ کرکے) اُٹھایا جائے گا۔ ایک اور جگہ قرآن پاک میں ہے کہ : اَيَعِدُكُمْ اَنَّكُمْ اِذَا مِتُّمْ وَكُنْتُمْ تُرَابًا وَّعِظَامًا اَنَّكُمْ مُّخْرَجُوْنَ ۝ هَيْهَاتَ هَيْهَاتَ لِمَا تُوْعَدُوْنَ ۝ (سورۃ المومنون آیت ۳۵، ۳۶) "یعنی وہ پیغمبر یہ وعدہ دیتا ہے کہ جب تم مرے اور خاک ہو گئے اور ہڈیاں ہو گئے تو پھر تم نکالے جاؤ گے، جس کا تم وعدہ دیئے جاتے ہو۔ یہ بہت دُور ہے!"

ظاہر ہے کہ مندرجہ بالا آیاتِ قرآنی کا اطلاق اس صورت میں کسی طرح ممکن نہیں جب کہ مرنے والے کی رُوح اسی دار الفناء میں مختلف اجسام بدلتی رہتی ہیں۔ خدا تعالیٰ سے دُعا ہے کہ مسلمانوں کو شیطان کی اس فریب کاری سے اپنی پناہ میں رکھے اور جو اس عقیدۂ باطلہ کے حامل ہیں، اُنہیں راہِ راست دکھا تاکہ وہ حق کو قبول کرسکیں! آمین ؛

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

راولپنڈی ٹیلیویژن سے ڈاکٹر اسرار احمد کے پروگرام "الکتٰب" کے بارے میں ایک خط!

عرض ہے کہ میں نے پروگرام "الکتاب" پابندی سے دیکھا اور دلچسپی سے سُنا — ایک متعین اور مختصر وقت میں قرآنِ حکیم کی ایک ایک سورۃ کی حکیمانہ تشریح، تفسیر حد درجہ جامع۔ روح پرور اور علم و حکمت کا خزینہ تھی — اور پھر آپکا سادہ۔ پُروقار مگر سحر انگیز اندازِ بیاں علم و عرفان کا ایک ایسا چشمہ تھا جس سے میں نے اپنی روحانی پیاس بجھائی —

اس اعلیٰ و ارفع پروگرام کی کامیاب ترتیب، تشکیل اور پیشکش پر آپکو اور پروڈیوسر جمشید فرشوری کو میری دلی مبارکباد قبول ہو — والسلام۔

۲/۳۷۷۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی　　مشتاق احمد

تصوّف، تحقیق و تجزیہ

از قلم حکیم نبی احمد سمن آباد، لاہور

ریاض (سعودی عرب) کے ہفت روزہ "الدّعوۃ" میں علاّمہ طریشی کا تصوّف پر ایک مقالہ شائع ہوا تھا، جس کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کرکے 'میثاق' کے لئے جناب حکیم نبی احمد صاحب (لاہور) نے ارسال فرمایا تھا جو پیشِ خدمت ہے۔ "تصوّف" وہ موضوع ہے جس کے مُؤیّدین اس کی حمایت میں غُلوّ کرتے ہیں تو اس کے ڈانڈے کفر اور شرک سے مل جاتے ہیں۔ اور اس کے معترضین اس پر تنقید کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ڈانڈے زیغ و ضلالت سے مل جاتے ہیں۔ یہ نتیجہ ہے ایک غیر اسلامی اصطلاح اختیار کرنے کا، اور توحیدِ خالص میں مشرکانہ فلسفوں کی آمیزش کا۔ اسلام میں جو تعلّق مع اللہ اور تزکیۂ نفس مطلوب و مقصود ہے، اور خالص توحید جس کو کہتے ہیں اُس کی مکمّل تعلیم کتاب و سنّت میں موجود ہے، اور اُس کے بلند ترین مقام کو ہمارا دین "احسان" سے تعبیر کرتا ہے۔

زیرِ نظر مقالہ تصوّف پر تنقید کے معاملہ میں آخری حد اور انتہا کو ظاہر کرتا ہے۔ نیز تحقیق و تجزیہ اور غور و فکر کی راہیں کھولنے میں کافی مُمد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ (مُرتّب)

تصوّف لفظی اعتبار سے ایک ایسا اجنبی لفظ ہے جس کا عربی لُغت میں کوئی وجود نہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے معنی میں خود صوفیا کا شدید اختلاف ہے اور اب تک یہ طے نہیں ہو سکا ہے کہ اس لفظ کا وہ کون سا مفہوم ہے جس کی رعایت سے اس کے عامل کو "صوفی" کہا جاتا ہے۔ پھر چونکہ یہ لفظ نہ قرآن مجید میں مذکور ہے نہ حدیث شریف میں بلکہ جماعتِ صحابہؓ میں سے بھی کسی ایک صحابیؓ نے اِس کو استعمال نہیں کیا ہے۔ اس لئے

ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خلافِ اسلام ایک ایسی بدعت ہے جس کی اسلام میں کوئی بنیاد نہیں رہی اس کی معنوی حیثیت تو اس میں آپ کو وہ وہ عجائبات دیکھنے کو ملیں گے، جن کو بیان کرنے سے ہم پہلے اپنے پروردگار سے معافی کے طلب گار ہیں۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ تقریباً تمام صوفیاء کسی نہ کسی طور پر حلول کے قائل ہیں۔ یعنی ان کی رائے میں خالق اپنی ہر مخلوق میں خود سمایا ہوا ہے۔ اُن کی ساری بحث وحدتِ مطلقہ پر آکے ٹھہرتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس عالم کے سوا کسی دوسری ذات یا چیز کا وجود نہیں۔ اُن کی رائے میں خدا ایک امرِ کلّی ہے جس کا خارج میں کوئی ذاتی وجود نہیں، وہ صرف اپنی جزئیات میں پایا جاتا ہے اور یہی نظریہ ان کو وحدۃ ادیان تک لے گیا ہے جس کے مطابق دنیا میں جتنے بھی مذہب ہیں خواہ وہ آسمانی ہوں یا انسان کے خود ساختہ وہ سب ان کے نزدیک ایک ہیں اور حق و ہدایت ان سب میں مشترک ہے۔ کسی ایک کے ساتھ مخصوص نہیں، یعنی گؤ سالہ پرستی اور خدا پرستی ایک ہی چیز ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ گویا شرک عین توحید اور توحید عین شرک ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم کچھ بہت بڑے بڑے جلیل القدر ائمۂ تصوف کے اقوال و آراء آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ آپ خود فیصلہ کر سکیں کہ ہم نے کوئی غلط بات تو نہیں کہہ دی۔ سب سے پہلے حضرۃ ابنِ عربی کو لیجیے جو تمام صوفیوں کی عقلوں پر چھائے ہوئے ہیں اور صوفیاء اُن کو "شیخِ اکبر" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ آپ : وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا کی تفسیر فرماتے ہوئے حدیث مبارک "من عادی لی ولیاً" کی توضیح یوں فرماتے ہیں کہ :

اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کی ذات میں داخل ہو جاتا ہے تو ظاہر میں تو وہ بندہ بندہ ہی رہتا ہے لیکن باطن میں خود خدا ہو جاتا ہے اور یہ دخول بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے انسان میں بصارت، سماعت، حرکت اور سکون داخل ہیں۔ اس کی واضح مثال یوں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی ذاتِ اقدس ہے جس میں اللہ تعالیٰ داخل ہو گیا تھا یا بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ کی ذات میں حضرت ابراہیمؑ خود داخل ہو گئے تھے۔ اس کو یوں بھی سمجھ لیجیے کہ پانی جب کپڑے میں داخل ہو کے اس کو گیلا کر دے تو آپ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ کپڑے میں پانی داخل ہے۔ اسی طرح آپ یہ بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ مخلوقات کی ہر صنف میں خالق کی ذات بھی داخل ہے اور یہ سماعت بصارت اور اس کے تمام جذبات و احساسات سب درحقیقت خالق ہی کے

اسی دلیل سے ابن عربی نے وحدۃ الوجود کا نظریہ قائم کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی مشہور تصنیف "فتوحاتِ مکیہ" میں لکھتے ہیں: "پاک ہے وہ ذات جس نے اشیاء کو پیدا کیا اور خود عین اشیاء رہا!"

اسی طرح اپنی دوسری تصنیف "فصوص الحکم" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اے اشیاء کو پیدا کرنے والے اور خود ان میں شامل رہنے والے یقیناً تو اپنی مخلوق میں خود ملا ہوا ہے۔ تو جو چیز پیدا کرتا ہے وہ تیری ذات میں لا انتہا ہے (گویا) تو ایک طرف محدود ہے۔ اور دوسری طرف لا محدود!"

صوفیاء کے نزدیک سب سے بڑا ربّ خواہشِ نفسانی ہے۔ چنانچہ یہی بزرگ یعنی شیخ اکبر افرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ کی تفسیر فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ خواہشِ نفسانی ہی سب سے بڑا معبود ہے۔ کیونکہ کسی بھی چیز کی عبادت اللہ کی عبادت سے جدا نہیں اور اللہ کی عبادت اس چیز کے ذریعہ سے ہی ہو سکتی ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا شیخ اکبر فسق و فجور کی خواہشوں کو بھڑکا کر ان کی عبادت کی دعوت دے رہے ہیں، اور اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ صوفی کی خواہش ہی سب سے بڑا ربّ ہے۔ اب تو آپ کو یقین آگیا ہوگا کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ آگے چل کر شیخ اکبر کفریات میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ فرماتے ہیں: "یہ کتے اور سؤر ہی تو ہمارے اللہ ہیں!" اللہ تو گرجے میں پادری بنا بیٹھا ہے۔

ان کا یہ ارشاد بھی ملاحظہ فرمائیے: "اللہ تعالیٰ کے متعلق لوگوں کے مختلف عقیدے ہیں اور میں اُن سب عقیدوں کا حامل ہوں!" (یعنی میں مسلمانوں کے علاوہ یہودیوں، نصرانیوں، مجوسیوں، غرض سب کا عقیدت مند ہوں)

اب ہم ان کو چھوڑ کے کچھ دیگر اکابرین صوفیاء کے ارشادات بیان کر کے آپ کو استغفار پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں:

صوفیوں کے ایک بہت بڑے بزرگ ابن الفارض ہیں، جن کو تمام صوفیاء سُلطانُ العاشقین کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ آپ نے تقریباً آٹھ سو اشعار کا ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں تحریر فرماتے ہیں کہ عرب کی مشہور معشوقات لُبنیٰ، لیلیٰ شُبینہ اور عُزّہ، یہ سب ذاتِ الٰہی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہی ان فانی معشوقوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ نیز ان

چاروں کے عاشق قیس، جمیل، کثیر، اور عامر بھی ذاتِ الٰہی ہیں۔ کیونکہ خدا ان کی صورت میں جلوہ گر ہے، یعنی صوفیاء کا خُدا عاشق یا معشوق کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور ایک کا دوسرے سے عشق گویا کہ اپنی ہی ذات سے ہوتا ہے۔

اب بتائیے کہ موجودہ زمانہ کا تصوّف ہم پر تو نکتہ چینی کرتا ہے کہ قرآن وحدیث سے اللہ تعالیٰ کے جو صفات ثابت ہیں ہم ان کو تسلیم کر کے اور ان پہ ایمان لا کے اللہ تعالیٰ کی جسمیّت کے قائل ہو گئے (خدا کی پناہ جو ہم اللہ کی طرف ایسی بات منسوب کریں جو اس نے نہیں فرمائی ہے) اور خود ان کے بزرگان تصوّف کہیں خواہشِ نفسانی کو خدا مانتے ہیں اور کہیں دنیا کے شہوانی عاشقوں اور معشوقوں کو ربوبیّت کا درجہ دیتے ہیں اور اسی عقیدہ کی بنا پر سلطان العاشقین کہلاتے ہیں۔

صوفیوں کے ایک اور بزرگ عبدالوہاب شعرانی گزرے ہیں جو صوفیوں میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اور "ہیکل صمدانی" کے لقب سے ملقب ہیں۔ یہ صاحب بہت سی کتابوں کے مصنّف ہیں جن میں "طبقاتِ کبریٰ" بڑی مشہور کتاب ہے۔ اس میں آپ کو ایسے ایسے خیالات نظر آئیں گے جو تمدّنی اور معاشرتی زندگی کے لئے انتہائی خطرناک کہے جا سکتے ہیں اور تمام انسانی قدروں کو نیست ونابود کر سکتے ہیں۔ اسی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ کی تفسیر فرماتے ہوئے اپنے محترم حضرت دسوقی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ جو اولیاء اللہ خوف وحُزن سے محفوظ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے متّصل رہتے ہیں، اور جو اللہ سے متّصل ہو وہ اللہ سے سرگوشی بھی کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کر لیا کرتے تھے اور میں اور دیگر اولیاء اللہ ازل میں اللہ اور اُس کے رسول کے سامنے موجود تھے۔ اللہ نے مجھے محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نور سے پیدا فرمایا اور حکم دیا کہ سارے اولیاء کو خلعت پہنا چنانچہ میں نے سب کو خلعت پہنا دیا پھر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ ابراہیم تو ان سب کا سردار ہے، اُس وقت میں تھا اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تھے اور برادرم عبدالقادر جیلانی میرے پیچھے تھے اور سیّد احمد کبیر رفاعی اُن کے پیچھے حضوؐر نے میری طرف متوجّہ ہو کے فرمایا ابراہیم! تو (دوزخ کے داروغہ) مالک کے پاس جا کے حکم دے کہ آگ بند کر دے اور (جنّت کے داروغہ) رضوان کے پاس جا کے حکم دے کہ جنّت کے دروازے کھول دے۔ چنانچہ میں دونوں کے پاس گیا۔

اور حکم دیا، جس کی دونوں نے تعمیل کی" یہ ہے حضرت شعرانی کی وہ دُر افشانی جسے نہ کسی نص سے واسطہ ہے اور نہ عقل سے۔

صوفیوں کے ایک اور بزرگ ابویزید بسطامی گذرے ہیں جو سلطان العارفین کے لقب سے ملقّب ہیں، آپ نے وحدت الوجود کے دعوے کے ساتھ ساتھ تکالیف شرعیہ مثلاً نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ سے معافی کا اعلان فرمادیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں، ایک بار میں حج کے ارادہ سے چلا، راستہ میں مجھے ایک قطب ملے، انہوں نے فرمایا بسطامی! تو حج کو کیوں جا رہا ہے، جا گھر واپس چلا جا، تو نے دل کی آنکھوں سے اللہ کو تو میری ذات میں دیکھ لیا، کیونکہ اللہ نے مجھے اپنا مسکن بنا لیا ہے۔ تو نے مجھے دیکھ لیا تو سمجھ لے کہ اللہ کو دیکھ لیا، میری عبادت کر لی تو اللہ کی عبادت کر لی، میرا طواف کر لیا تو گویا اللہ کا طواف کر لیا۔ دیکھ! یہ نہ سمجھ لینا کہ میں اللہ کے سوا کوئی اور ذات ہوں۔ یہ سُن کر ابویزید حج کئے بغیر راستہ سے اپنے گھر لوٹ آئے، اس بناء پر تو ہم ابویزید بسطامی اور فرقہ باطنیہ کو ایک ہی سمجھ سکتے ہیں، جس نے تکلیفاتِ شرعیہ کو ساقط اور محرّمات کو منہاج ٹھہرا لیا ہے۔ انہی ابویزید کے بارے میں پروفیسر نکلسن نے لکھا ہے کہ اُن ہی نے تصوّف میں وحدۃ الوجود کا تصوّر داخل کیا ہے۔ ناظرینِ کرام دیکھیں گے کہ وہ خیالات تصوّف سے جو برحق ایمان اور توحید کے خلاف ہیں ان صوفیوں کے متعلق اتنا کہنا کافی ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ ایک بار اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے پاس بُلایا اور فرمایا کہ بسطامی! میرے بندے تجھے دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ باری تعالیٰ تو مجھے اپنی وحدانیت سے نواز دے، اپنی انانیت کا خلعت عطا فرما دے اور اپنی احدیّت تک بلند فرما دے۔ تاکہ لوگ مجھے دیکھیں تو کہہ دیں کہ ہم نے خدا کو دیکھ لیا، اُس وقت تو ہی تو ہو اور میں وہاں نہ ہوں" ابویزید اپنی ہرزہ سرائی میں یہاں تک آگے بڑھ گئے کہ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی تھی اور میں نے اللہ کو دیکھنے کی کبھی خواہش نہیں کی۔ بلکہ خدا نے مجھے دیکھنے کی خود خواہش کی یہاں تک آپ نے صوفیاء کا حال اعتقادی نقطۂ نظر سے سُنا۔ اب ذرا عبادات کے سلسلہ میں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ صوفیوں نے عبادت کے وہ وہ نئے طریقے اور اوراد و وظائف کے وہ وہ طرز ایجاد کئے ہیں جو نہ کتاب اللہ میں ہیں نہ سُنّتِ رسول اللہ میں، اور نہ شریعتِ اسلامیہ سے اُن کی کوئی سند ملتی ہے۔ یہ وہ بیہودہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایتِ خداوندی

سے فرار اختیار کر رکھا ہے اور تاریکی کے دامن میں پناہ گزین اور بتکدوں کے ایسے گنبدوں میں بند ہیں جو مجوسیت کے شرک سے لبریز ہیں اور جہاں ابن بشیش کی اختراع کردہ دعا کی صدائے بازگشت گونج پیدا کرتی رہتی ہے اور گرد وپیش کے شیوخ جب یہ لغے الاپتے ہیں تو فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ یہ دُعا آپ بھی سُن لیجئے : اللّٰھم انشلنی من اوحال التوحید وا دخلنی فی عین بحر الوحدۃ ۔ (اے اللہ تو مجھے توحید کی دلدل سے نکال اور بحرِ وحدت میں غرق فرما دے!)

صوفیوں میں زہد کے جو طریقے جاری ہیں ذرا اُن پر بھی نگاہ ڈالئے :-

(۱) ابو یزید بسطامی فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ کا عرفان خالی پیٹ اور ننگے بدن کی حالت میں ہوا ——— (۲) سہل بن عبداللہ تستری طاقتِ بدن کی خاطر غذا کھانے کو منع فرماتے ہیں۔ ان کی رائے میں ترکِ غذا سے اگر اتنی کمزوری پیدا ہو جائے کہ انسان ادائے عبادت کے قابل نہ رہے تو یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ غذا سے بدن میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ انسان عبادت کے قابل ہو۔ ان کے نزدیک بھوک کے بیٹھے نماز پڑھنا، پیٹ بھر کے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے افضل ہے !" ——— غالباً ان کی نظر سے یہ حدیث نہیں گذری کہ (ترجمہ : ضعیف مسلمان سے طاقتور مسلمان اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند اور محبوب ہے) اسی ریاضتِ ذہنی کے ماتحت وہ گوشت ، انڈا ، حلوہ اور فواکہات کھانے کو منع فرماتے ہیں اور جَو کی روٹی اور نمک کی کنکری کو پسند کرتے ہیں !

بعض صوفیاء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ ۳ ماشہ گوشت کھا لینے سے چالیس دن کے لئے دل میں سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ زُہد کے اس طریقہ کو نہ عقل تسلیم کرتی ہے اور نہ شریعت بلکہ دینِ اسلام میں اس کا نام ونشان بھی نہیں۔

صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ نبوّت رسالت سے ، اور ولایت نبوّت سے افضل ہے۔ اور ولی کا مرتبہ نبی اور رسول دونوں سے بلند ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

مقام النبوّۃ فی برزخ	یعنی نبی کا مقام ایک ایسا درجہ ہے
فوق الرّسول ودون الولی	جو رسول سے اوپر اور ولی سے نیچے ہے

اُن کا یہ بھی قول ہے کہ اولیاء اللہ ، انبیاء علیہم السّلام کے شریک فی الولایت ہیں اور ولایت نبوّت سے افضل ہے۔ اس سے بڑا گمراہی کا اور کون سا عقیدہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہے صوفیاء کے تصوّرِ عبادت کا ایک مختصر سا خاکہ جس میں ایک پہلو اخلاقی حیثیت کا بھی ہے۔

اب ذرا اخلاقی حیثیت سے بھی نظر ڈالیے، صوفیاء تجرد پسند ہیں، ان کی رائے میں جنسی تعلقات سے باز رہنا کرامت اور تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے، ان کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے ان میں آپ کو پلیدی، مخول، پاگل پن، کفر، دجل، فتنہ اور دروغ بہتان سب کچھ مل جائے گا۔ ملاحظہ فرمائیے:

(۱) محمد بن علی ابوجعفر الشلمغانی ایک مشہور بزرگ ہیں جو ابن الفراقید کے نام سے مشہور ہیں، وہ فرماتے ہیں، خدا سارے معبودوں کا معبود ہے اور دنیا کی ہر چیز میں اس کی وسعت ظرف کے مطابق داخل ہے۔ حتیٰ کہ آدم و ابلیس دونوں میں بھی داخل ہے۔

(۲) حضرت شعرانی کسی بزرگ کی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ مکمل صاحب کشف تھے ان کا ایک کتا تھا جو گدھے کے برابر تھا اور ہمیشہ ان کے کاندھوں پر بیٹھا رہتا تھا۔ اس کو بھوک لگتی تو آپ کی توجہ اور کرامت سے بھیڑ کا گوشت کتے کی خواہش پر کبوتر بن جاتا تھا۔

(۳) حضرت شعرانی کے دوستوں میں ایک صاحب عصفیر نامی تھے۔ ان کی بابت فرماتے ہیں کہ وہ بچپنے ہی سے صاحب کرامت تھے۔ یہ ایک باغ میں رہتے تھے، شہر کو بھیڑیے یا بجو پر سوار ہو کر آتے تھے۔ پانی پر چل لیتے تھے اور ان کا پیشاب تازہ دودھ کی طرح ہوتا تھا۔

(۴) حضرت شعرانی نے اپنے ایک بزرگ ابراہیم ذسوقی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں چھ سال کا تھا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے ملاء اعلیٰ کی ہر چیز دکھائی وہاں میں نے سورۂ فاتحہ کا ایک نقطہ دار نقطہ بھی دیکھا جس میں بہت سے انسان اور جن لوٹ رہے تھے۔ میں نے اس کو سمجھ لیا اور سمجھ لینے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پھر اللہ کے حکم سے ہر ساکن چیز متحرک اور ہر متحرک چیز ساکن ہو گئی، پھر دیکھا تو میں چودہ سال کا ہو چکا تھا

(۵) ان ہی شعرانی نے شونیمی کے حوالہ سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کے ایک بزرگ بیمار پڑے اور مرنے کے قریب آ گئے۔ اس پر شونیمی صاحب نے ان کو اپنی عمر میں سے دس سال ہبہ کر دیئے لیکن ان کی عدم موجودگی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ آپ ان کے یہاں آئے تو ان کو غسل دیا جا رہا تھا۔ آپ نے تعجب سے پوچھا کہ کیسے مر گئے۔ پھر فرمایا کہ خدا کی قسم اگر میں موجود ہوتا تو ان کو ہرگز مرنے نہ دیتا۔ پھر آپ نے ان کے غسل کا سارا پانی پی لیا۔

(۶) شعرانی اپنے بزرگ محمدؒ خضری کے متعلق لکھتے ہیں کہ مجھ سے شیخ ابوالفضل سرسی نے یہ واقعہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ جمعہ کے دن حضرت خضری مسجد میں تشریف لائے تو لوگوں نے استدعا کی کہ آج آپ خطبہ دیں لہٰذا آپ منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا لوگو! دیکھو تمھارا ربّ حضرت ابلیس علیہ السّلام ہے۔ اس پر لوگ چیخنے لگے کہ آپ نے کلمۂ کفر کہہ دیا۔ یہ سن کر آپ تلوار کھینچ کے منبر سے اُتر آئے۔ لوگ خوف کے مارے بھاگ نکلے۔ آپ پھر منبر پر جا کے بیٹھ گئے اور عصر کی اذان تک وہیں بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد قرب و جوار کی مختلف بستیوں کے لوگ آئے اور ہر بستی کے لوگوں نے بیان کیا کہ شیخ نے تو نمازِ جمعہ ہمارے ہاں پڑھائی ہے۔ شمار کرنے سے معلوم ہوا کہ سب مل کر تیس خطبے ہوئے (تیس مسجدوں میں نماز پڑھائی) حالانکہ وہ ہمارے یہاں موجود تھے۔

اسی قسم کی اور بہت سی چیزیں آپ کو شعرانی کی طبقاتِ کبریٰ میں مل جائیں گی۔ یہ تو مُشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ہم نے پیش کی ہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ جامعہ ازہر کے مکتبہ سے یہ کتاب طبع ہو کر شائع ہوئی ہے۔

اس کے بعد میں مراسلہ نگار سے پوچھتا ہوں کہ آپ کے قول کے مطابق شریعت اصل اور حقیقت فرع ہے۔ اس لئے کہ شریعت ظاہر اور طریقت پوشیدہ ہے تو یہ تو بتاؤ کہ کون سی حقیقت پوشیدہ ہے؟ کس سے پوشیدہ ہے؟ اور کتنا حصّہ پوشیدہ ہے؟ ذرا بتاؤ کہ ہمیں بھی علم و بصیرت ہو جائے۔ کیا یہ علم تمھارے لئے ہی ہے دوسروں کیلئے نہیں۔

محترم مراسلہ نگار! دین کا کوئی معاملہ پوشیدہ نہیں ہے۔ کیا آپ کی نظر سے یہ ارشادِ ربّانی نہیں گذرا کہ (ترجمہ: "اللہ ہی تو ہے جس نے اِن اُمیوں میں سے ہی ایک شخص کو اپنا رسول بنا کے اُن کے پاس بھیجا جو اُن پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور اُن کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے!") اور کیا آپ تک یہ ارشادِ ربّانی نہیں پہنچا ہے کہ: (ترجمہ: "اے رسول! جو کچھ ہم نے تم پر تمھارے ربّ کی طرف سے نازل کیا ہے اُسے کُلیتہً پہنچا دو۔ اگر ایسا نہ کیا تو سمجھ لو کہ تم نے اُس کے پیغام کو پہنچایا ہی نہیں اور اللہ تمھیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا!") (مائدہ آیت ۶۷)

لیکن اس پر یوں تعجّب نہیں کہ صوفیاء کے وہ زہریلے افتراء آت ہی تو ہیں جو اسلامی اُصولوں کو منہدم کرنے اور اہلِ اسلام کے خلاف سازش کے طور پر اس میں داخل کر دی گئی

ہیں۔ ملحد صوفیاء کے نزدیک شریعت کے ظاہری احکام، رسولوں کی بیان کردہ گذشتہ کی خبریں یا آئندہ آنے والی چیزیں مثلاً آخرت، حشر ونشر اور جنت و دوزخ ان میں سے کوئی چیز بھی الفاظ کے ظاہری مفہوم و معنی سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ ان الفاظ سے عوام کو مصلحتاً صرف اس لئے مخاطب کیا گیا ہے کہ ناقص ذہن کیلئے ان کی تصریحات کو سمجھنا ممکن نہیں ہم یہاں چند نمونے پیش کرتے ہیں، جو ابن سینا کے رسالہ اضحویہ ص۴۴ سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ابن سینا کہتا ہے کہ شریعت کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں ایک ہی قانون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس نبی کی زبان سے کوئی شریعت ادا ہوئی ہے اس کے مخاطب جمہور عوام ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جمہور عوام کو وہ حقیقت توحید سمجھنا ممکن نہیں جس کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ تاکہ صحیح طریقہ سے توحید اور صالح اقرار توحید و تقدیس کے ساتھ ہو سکے۔ پھر قرآن میں اس کی طرف نہ کوئی اشارہ ہے اور نہ تفصیلی بیان جو توحید کے لئے ضروری ہے۔ پس جب توحید کے بارے میں اس کا یہ حال ہے تو باقی اعتقادی اُمور میں کیا حال ہوگا!"

صوفیاء ان ہفوات سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حقیقت شریعت کا جزء نہیں، اور قرآن کی بیان کردہ شریعت تو ظاہر ہے مگر حقیقت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ دیکھئے اس مفروضے میں دو زبردست خرابیاں ہیں ایک تو قرآن پر یہ اتہام لازم آتا ہے کہ اس میں حقیقت کو واضح کرنے کی صلاحیت نہیں۔ دوسرا اتہام امت کی غالب اکثریت پہ لازم آتا ہے۔ کہ وہ حقیقت سے واقف نہیں بلکہ اُمت سے آگے بڑھ کے تمام صحابہؓ پر بھی یہی الزام عائد ہوتا ہے کیونکہ وہ صوفی نہ تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ صحابہؓ صوفیوں کے نزدیک حقیقت سے واقف تھے تو اس کی دلیل کیا ہے، کیا کسی صحابیؓ سے یہ افتراء ثابت ہے؟ کہ شریعت اور حقیقت دو متغائر حصّوں میں تقسیم ہے؟ کیا کسی صحابیؓ سے فناء، فناء الفناء اور وحدتِ مطلقہ وغیرہ (جو صوفیاء کے نزدیک علمِ حقیقت کے معارف ہیں) کی اصطلاحیں منقول ہیں؟ اس سے زیادہ اِن ہفوات سے خود رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر اتہام آتا ہے کہ آپؐ نے دین کے حصّہ حقیقت کو چھپائے رکھا، اور اس قسم کا اتہام رسول پہ لانا بلکہ اس کا گمان کرنا بھی صریحاً کفر ہے۔

ابنِ عجیبہ نے حکم بن عطاء سکندری کی شرح میں جو کچھ کہا ہے اُسے خود سے سُنئے:۔

وہ کہتا ہے: "علمِ تصوّف کے اوّل بانی آنحضورؐ تھے جس کی تعلیم حضورؐ کو حضرت جبرائیل کے ذریعہ خدا کی طرف سے دی گئی تھی۔ آپ پہلی بار شریعت لے کر آئے اور اس کی تکمیل کے بعد دوبارہ حقیقت لے کر نازل ہوئے، جس کو حضورؐ نے صرف بعضوں تک رکھا۔!"
(ج ۱، ص ۵، طبع ۱۳۳۱ھ بحوالہ مصدرِ تصوّف ص ۱۹۴، ۱۹۵)

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ دین تصوّف کو شریعت سے ایک دشمنی ہے اور معاذ اللہ حضورؐ پر یہ الزام عائد ہوتا ہے کہ آپ نے بعض حصّہ وحی کی تبلیغ ہی نہیں فرمائی۔!! حَاشَا وَکَلَّا ثُمَّ حَاشَا وَکَلَّا۔

ناظرینِ کرام! آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان صوفیاء کے اقوال و ملفوظات سے شریعتِ مطہرہ کی تکذیب ہوتی ہے اور اوامر و نواہی معطّل قرار پاتے ہیں، نیز رسولوں پر بھی الزام آتا ہے اور ان کے پیغام میں شکوک و شبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور ان ہی صوفیوں کا دین یہ بتاتا ہے کہ قرآن میں وہ چیز موجود نہیں جو توحید کا راستہ دکھائے، یا فکرِ انسانی کے لئے وہ شے پیش کرے جو اللہ پر اعتقاد رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس قسم کی ڈھٹائی انہوں نے اختیار کر رکھی ہے اور اپنی کتابوں میں وہ چیزیں لکھتے ہیں جن کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہمارے مراسلہ نگار نے چوتھی بات سیّد احمد بدوی کے بارے میں کہی ہے کہ: "کیا یہ وہی بزرگ نہیں جنھوں نے نفسانی شرارتوں کو وزیر کرنے کی قدرت حاصل کر لی اور پوری زندگی پاکیزگی میں گذار دی، کوئی شادی نہیں کی!" آخر مراسلہ نگار کہنا کیا چاہتے ہیں اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ کیا بدوی کا شادی نہ کرنا کوئی قابلِ تعریف فعل ہے۔ اگر یہ مطلب ہے تو مراسلہ نگار کی غلط فہمی ہے۔ کیا اُن کی تردید میں حضور علیہ السّلام کا یہ ارشاد کافی نہیں ہے کہ: ترجمہ "مجھے اللہ تعالیٰ نے رہبانیّت لے کر نہیں بھیجا ہے"۔ جو لوگ عبادت میں خواہ مخواہ کی جفاکشی کو پسند کرتے ہیں یا راہبانہ زندگی کو عبادت سمجھتے ہیں، اُن کی تردید کے لئے یہ ارشادِ نبویؐ بہت کافی ہے کہ: "ترجمہ۔ بخدا میں تم سب سے زیادہ خدا ترس اور متّقی ہوں لیکن دیکھو میں نفلی روزے رکھتا ہوں اور نہیں بھی رکھتا، رات کو نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں، اور بیویاں بھی رکھتا ہوں۔ لہٰذا میری سُنّت سے جو شخص رُوگردانی کرے گا، وہ ہم میں سے نہیں ہوگا"
ناظرینِ کرام! کو معلوم ہونا چاہیئے کہ رہبانیت اور بے روح زندگی صوفیاء کی ہی تعلیم

ہے اور یہ اُن ہی کا اندازِ فکر ہے کہ متاہلِ زندگی سے کٹ کے رہنا اور تجرّد اختیار کرنا فقیری میں زیادہ مُعین و مددگار ہوتا ہے، توجّہ کو زیادہ یکسُو رکھتا ہے نیز زندگی کو زیادہ خوشگوار بناتا ہے بخلاف اس کے شادی سے انسان عزیمت کی بجائے رخصت پر عامل ہو جاتا ہے اور سکون سے بے سکونی کی طرف چلا جاتا ہے، اولاد و ازواج کے چکّر میں پھنس کے دین کی بجائے دُنیاداری کی طرف مائل ہو جاتا ہے — یہ ہے ابوحفص سُہروردی کا پیش کردہ خُلاصہ اس رائے کا جو صُوفیاء شادی کے بارے میں رکھتے ہیں؛ اسے وصول الی اللہ کی راہ میں رکاوٹ بتاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ابوسلیمان دُرّانی کی رائے شادی کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں کہ: "اپنے رفقائے طریقت میں مجھے ایک ساتھی بھی ایسا نظر نہیں آیا جو شادی کے بعد اپنے رُوحانی مرتبہ پہ قائم رہ گیا ہو۔"

شعرانی رباح بن عمرو قیسی کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں کہ: "کوئی شخص صدّیقیت کے مقام تک صرف اس وقت پہنچتا ہے جب وہ بیوی کو اس طرح چھوڑ دے گویا وہ بیوہ ہو گئی ہے اور اولاد سے اس طرح بے تعلق ہو جائے کہ وہ یتیم ہو گئی ہے اور خود کُتوں کے مسکن میں گوشہ نشین ہو جائے۔"

سُن لیا آپ نے، یہ ہے وہ دینِ تصوّف جو انسانیت کو اصرار کے ساتھ بے مایہ ہو جانے کا بُلاوا دیتا ہے، اور اس بلاوے کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ انسانیت ہر قسم کے فسق و فجور سے آلودہ ہو جائے — لہٰذا ہر مسلمان کو تصوّف سے ہوشیار رہنا چاہیئے اور روزمرّہ کی عام زندگی کو اس سے پاک رکھنا چاہیئے۔ جس دین کیلئے ہمیں زندہ رہنا فرض ہے وہ صرف دینِ اسلام ہے جو قرآن و سُنّت پر عمل کرنے کا نام ہے۔ اسی دین نے سارے مسلمانوں کو ایک لقب مسلم سے یاد کیا ہے: هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ط — اسلام میں قرآن و سُنّت کے سوا کسی شخص یا کسی طریقہ کی طرف انتساب جائز نہیں — بس آؤ ایک دینِ حق اسلام کی طرف آؤ۔

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور کے فون نمبر
تبدیل ہو گئے ہیں نئے نمبر یہ ہیں:

دورِ انتخاب "گاہے گاہے بازخواں ۔۔۔۔۔!"

مسلمان مشرک

تحریر:- علامہ عبدالرزاق ملیح آبادی (۱۹۲۵ء)

یہ مضمون علامہ عبدالرزاق ملیح آبادی نے نصف صدی پہلے ۱۹۲۵ء میں "الوسیلہ" کے اردو ترجمہ میں مقدمہ کے طور پر لکھا تھا۔ ایک دردمند موحد دل کی یہ پکار "عبرت" کے لئے پیش کی جارہی ہے۔ (ج۔ر)

حضرت انسؓ بنی اُمیہ کے زمانے میں رویا کرتے تھے کہ عہدِ اوّل کا دین باقی نہیں رہا۔ اگر وہ ہمارے اس زمانے کو دیکھتے تو کیا کہتے؟ کیا وہ ہمیں "مشرک" قرار نہ دیتے اور ہم انہیں کوئی بُرا نام نہ دیتے کیونکہ اِس وقت اور اُس وقت کے اسلام میں اب اگر کوئی مشترک چیز باقی رہ گئی ہے تو صرف لفظِ اسلام ہے یا چند ظاہری و رسمی عبادتیں ہیں۔ اور وہ بھی بدعت کی آمیزش سے پاک نہیں۔ کتاب اللہ جیسی آسمان سے اُتری تھی اب تک بے غل و غش قائم ہے سُنّتِ رسول اللہ بھی مدوّن و محفوظ مسلمانوں کے ہاتھوں میں موجود ہے، مگر کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ دونوں مہجور و متروک ہیں، طاقوں اور الماریوں کی زینت ہیں، یا گنڈوں، تعویذوں میں مُستعمل ہیں۔ مسلمان اپنی عملی زندگی میں اُن سے بالکل آزاد ہیں، اور باوجود اِدّعائے اتباع اُن سے مخالف چل رہے ہیں۔ اجمیر کا عرس دیکھنے کے بعد کون کہہ سکتا ہے یہ وہی مسلمان ہیں جو حامل قرآن اور علمبردارِ توحید تھے؟ اودھ کے ایک ہندو رہنما نے اجمیر کی کیفیت دیکھ کر کہا تھا — "اب تک مجھے شک تھا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ہوسکتا ہے مگر آج یقین ہوگیا کیونکہ ہمارے اور مسلمانوں کے مذہب میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف ناموں کا ہے حقیقت دونوں کی ایک ہی ہے!" اور یہ اُس نے سچ کہا۔ کیونکہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے شرک میں اگر فرق ہے تو ناموں اور طریقوں ہی کا ہے ورنہ حقیقت تقریباً ایک ہے۔ ہندو بتوں کے سامنے جھکتے

ہیں تو مسلمان قبروں کے سامنے ۔ ہندو رام و کرشن کی پرستش کرتے ہیں تو مسلمان جیلانی و اجمیری کی! یہ کہنا کہ ہم پرستش نہیں کرتے، اُنہیں خدا نہیں سمجھتے، محض بے معنی ہے کیونکہ ہندو بھی بجز اللہ واحد کے کسی کی بھی خدا سمجھ کر پرستش نہیں کرتے، اور نہ مشرکین عرب کرتے تھے، جیسا کہ اس کتاب میں مفصل مذکور ہے ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تم اپنی پرستش کو "پرستش وعبادت" نہیں کہتے کچھ اور نام دیتے ہو، مگر ناموں کے اختلاف سے حقیقت تو بدل نہیں سکتی ۔

حساس آدمی کے لئے مُسلمانِ مُشرکوں کے حالات وخیالات معلوم کرنا ایک ناقابلِ برداشت مصیبت ہے ۔ اس فرقہ میں عقل ونقل دونوں کا کال ہے ۔ ایک طرف تسلیم کرتے ہیں کہ خدا علام الغیوب ہے، سمیع وبصیر ہے آسمانوں اور زمینوں میں ایک ذرہ بھی اُس سے اوجھل نہیں اور نہ بغیر اُس کی مرضی کے حرکت کر سکتا ہے، وہ ہم سے دُور نہیں، نزدیک ہے، اور اتنا نزدیک کہ اُس سے زیادہ نزدیکی ممکن نہیں، پھر وہ رحمٰن ورحیم ہے، غفور وغفار ہے، سخی ہے، بے حساب دیتا ہے، جبار بادشاہ نہیں کہ کسی کو اپنے دَر پر آنے نہ دے، ہر وقت اُس کا دروازہ کھُلا ہے، ہر وقت اُس کا ہاتھ پھیلا ہے، ہر وقت اُس کا لنگر جاری ہے، یہ سب اور اس سے زیادہ مانتے ہیں، مگر . . . . . "مگر" کے آگے عقل ودانش کی موت ہے، انسانیت اور انسانی شرافت کا ماتم ہے! مگر کے بعد یہ ہے کہ قبروں کے سامنے جھُکنا ضروری ہے! مُردوں سے منتیں ماننا لازمی ہے! سفارش وشفاعت کے بغیر اُس دربار میں رسائی ناممکن ہے، یہ قبر غوث اعظم کی ہے جو مر جانے کے بعد بھی "غوث" ہیں، اور ملک الموت سے قبض کی ہوئی رُوحوں کا تھیلا چھین سکتے ہیں! "یہ محبوب سبحانی" ہیں "عاشق جاں نثار" کو ضد کر کے مجبور کر دیتے ہیں! یہ "غریب نواز" ہیں، اور مرنے پر بھی مٹھیاں بھر بھر کے دیتے ہیں . . . . .! چنانچہ انسانیت واسلام کے یہ مُدعی جوق در جوق قبروں پر جاتے ہیں، ماتھے گھستے ہیں، ناک رگڑتے ہیں، اور وہ سب کچھ کرتے ہیں جو کوئی شریف النفس خوددار انسان کسی مخلوق کے سامنے نہیں کر سکتا ۔ انسان کے پاس سب سے بڑی دولت اس کی اپنی انسانیت ہے، یہ جانتے ہیں اور اس متاع عزیز کو چُونے اور اینٹ کے چبوتروں پر بڑی بے دردی سے قربان کر آتے ہیں!

اگر کہا جاتا ہے کہ دیکھو کیا کرتے ہو جو شریعت نے منع کیا ہے، شرک ٹھیرایا ہے، جہنم سزا بتائی ہے تو جواب اعراض و انکار ہے، تاویل و تحریف ہے۔ شریعت حقیقت کی بحث ہے، ظاہر و باطن کی بحث ہے، وہابی و حنفی کا فرق ہے۔ قرآن کی آیت اور محمد رسول اللہ کی حدیث کے مقابلہ میں حسن بصری، شبلی، جیلانی، چشتی کے ملفوظات ہیں۔ حالانکہ ان میں سے کسی نے بھی کوئی شرک جائز نہیں رکھا۔ مگر کس سے کہا جائے؟ کان ہوں تو سنیں، آنکھیں ہوں تو دیکھیں، دل ہوں تو سمجھیں:-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ (۹ : ۱۲)

ترجمہ: اُن کے دل ہیں مگر وہ اُن کو سمجھنے کے لئے استعمال نہیں کرتے، دیکھتے نہیں اُنکے کان ہیں مگر وہ ان سے اُن کی آنکھیں ہیں مگر وہ اُن سے سُنتے نہیں۔ دراصل وہ جانوروں کی طرح ہیں بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے (الاعراف: آیت ۱۷۹)

یہ صرف عوام کا ہی حال نہیں کہ جہالت کی وجہ سے معذور رکھے جائیں، اُن لوگوں کا بھی ہے جو اپنے تئیں مُنہ پھاڑ پھاڑ کے "علماءِ اُمّت"۔ "وارثِ علومِ نبوّت" اور "انبیاءِ بنی اسرائیل" کا مشابہ بتاتے ہیں، ایک طرف اسفارِ شریعت کے حامل اور دوسری طرف حقیقت و طریقت" کے رازداں ہونے کے مُدّعی ہیں۔ دراصل یہی لوگ اُمّتِ محمدیّہ کے لئے اصل فتنہ اور تمام تباہیوں اور بربادیوں کے اصلی سبب ہیں۔ یہ علماءِ سوء اس اُمّت کے "فقیہی"، "فریسی"، "صدوقی" ہیں، "ہاروت و ماروت" ہیں۔ "رؤس الشیاطین" ہیں۔ انہیں نے شریعت کی تحریف کی ہے۔ انہیں نے کتاب و سُنّت کا دروازہ مسلمانوں پر بند کیا ہے۔ انہیں نے طریقت و بدعت کی تاریکی پھیلائی ہے۔ انہیں نے اسلام کا نام لے کر اسلام کو مسلمانوں کے دلوں سے اُکھاڑ پھینکا ہے۔ تیرہ سو برس کی پوری تاریخ ہمارے سامنے کھلی رکھی ہے۔ وہ کون سی مُصیبت ہے جو ان کے ہاتھوں نہیں آئی۔ وہ کون سی گمراہی ہے جس کا جھنڈا انہوں نے اپنے کاندھوں پر نہیں اُٹھایا؟

حضرت عبداللہ بن مبارک کہہ گئے ہیں :۔

وَهَلْ بَدَّلَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ ۔۔۔ وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

ترجمہ :۔ کیا دین کو بادشاہوں، علماء سوء اور صوفیوں کے علاوہ کسی اور نے بدل ڈالا ہے ۔؟

الفاظ سخت ضرور ہیں اور شاید قابلِ مواخذہ بھی ہیں، مگر دل و جگر میں جو گھاؤ پڑے ہیں، اور زیادہ ماتم پر مجبور کرتے ہیں ۔ کون انسان ہے جو تیس کروڑ انسانوں کی بے دردانہ تباہی دیکھے اور خاموش رہے ؟ کون مسلمان ہے جو اُمتِ مرحومہ پر یہ قزاقی تاخت اپنی آنکھوں سے دیکھے اور چُپ رہے ؟ کیا اس کے بعد بھی انسان دیوانہ نہ ہو جائے گا کہ دن کو رات بتایا جاتا ہے، آفتاب کو سیاہ ٹیکا کہا جاتا ہے، حق کو باطل، اور باطل کو حق ٹھیرایا جاتا ہے ؟ کون مسلمان ہے جس کے دل میں ذرا بھی نورِ ایمان ہو، اور شریعت کو ضلالت، سنّت کو بدعت، ایمان کو کفر، توحید کو شرک اور شرک کو توحید ہوتے دیکھے، اور جوش سے اُبل نہ پڑے ؟ مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ "کتاب و سُنّت کا فہم ناممکن ہے، لہٰذا اس سے دُور رہو، اشخاص کی تقلید واجب ہے لہٰذا بے چُون وچرا ہمارے پیچھے چلے چلو، قبریں اُونچی کرو، قبّے بناؤ، اولیائے متّقین مانو، خدا تک مخلوق کو وسیلہ بناؤ جو چاہو کرو بخشے جاؤ گے ۔ کیوں کہ شفیع المذنبین کی اُمّت ہو ۔ یہی دین ہے، یہی شریعت ہے ۔ یہی سُنّت ہے !" کیا ہم یہ سب سُنیں اور خاموش بیٹھے رہیں ؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مصلحین امّت اُٹھیں اور علماءِ سُوء کے اس شرذمۂ مشؤمہ کے چہرہ سے نقاب اُلٹ دیں تاکہ مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اِن بڑی بڑی پگڑیوں کے نیچے شیطان کو سجدہ کرنے والے سر ہیں، اور ان لمبی گھنی ڈاڑھیوں کی اوٹ میں کفر و ریا کی سیاہی چھپی ہوئی ہے ؟

کیا مسلمان اپنے "عالموں" اور "رہنماؤں" کے اسلام و اصلاح کا حال سُننا چاہتے ہیں ؟ اچھا ایک مستقل کتاب کا انتظار کریں ۔ یہاں اس مختصر دیباچہ میں گنجائش نہیں تاہم عبرت کے ساتھ یہ واقعہ نوٹ کر لیں، کہ ان کے ایک "مستند عالم" تے جو "صوفی" اور شاید "پیر" بھی ہیں ۔ تحریک خلافت کے دوران میں تجویز پیش کی تھی کہ علماء و مشائخ کا ایک وفد مرتّب ہو کر "اجمیر شریف"

جائے، اور خواجہ صاحب کو اُمّت کی ایک ایک مصیبت سُنا کر فریاد کرے! صرف تجویز ہی نہیں بلکہ سُنا ہے کہ عملاً یہ مولوی صاحب اپنے ہم مشربوں کے ساتھ شدِّ رحال کر کے گئے اور مزار پر خُوب روئے پیٹے۔ مگر افسوس! وہاں سے کوئی جواب بِلا اور بے مُراد لوٹے چلے آئے۔ کیا یہی وہ توحید ہے جس کی بُنیادیں قرآن نے قائم کی تھیں، جس کی حفاظت کے "علماءِ دین" مدّعی ہیں اور جس کے اِتّباع و تمسک پر مسلمانوں کو ناز ہے؟ اگر خواجہ صاحب اُمّتِ محمدیہؐ کو اس کے مصائب سے نجات دِلا سکتے ہیں تو رام و کرشن کی خدائی پر مسلمان کیوں مُنہ بناتے ہیں؟ — اس اجمیری وفد کی تحریک پرائیویٹ نہ تھی، اخبارات کے کالموں میں علانیہ کی گئی تھی، مگر کسی عالِم نے بھی یہ اعلان کرنے والے کی زبان نہ پکڑی کہ یہ شرک ہے۔ بلکہ بہت سے مولویوں نے تو اس کی تحریراً تائید کی جیسا کہ اخبارات کے پُرانے فائل گواہ ہیں۔ کیا یہی وہ حفاظتِ دین ہے جس کا بیڑا اُٹھائے ہوتے ہیں؟

اور اے کاش! ضلالت و بدعت کی حمایت علماء کے اُسی گروہ میں محدود ہوتی جسے بدعتی کہا جاتا ہے، اور اُس گروہ میں مُنتقِل نہ ہوتی جو اصلاح و تجدّد کا مُدّعی ہے۔ میں یہ المناک واقعہ انتہائی رنج و اندوہ کے ساتھ تاریخ کے حوالے اور مسلمانوں کے گوش گزار کرتا ہوں کہ ابھی چند دن کی بات ہے کہ اس جماعت کے ایک تعلیمی مرکز کے شیخِ اعظم اور دُوسرے مشائخ نے "تعزیہ داری جیسی صریح بدعت بلکہ "شرک" کے خلاف فتویٰ دینے سے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ موجودہ حالات میں ایسا فتویٰ "خلافِ مصلحت" ہے!

کیا یہی طریقہ شریعت کی حفاظت کا ہے؟ کیا یہی نیابتِ انبیاءؑ ہے جس کا فرض ہمارے علماء اِس خوش اُسلوبی سے انجام دے رہے ہیں؟ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ مسلمان آنکھیں کھولیں، اپنے مذہبی پیشواؤں کی حقیقت معلوم کریں اور دین کی حفاظت اور شرک و بدعت کے ازالہ کے لئے خود آگے بڑھیں؟ اسلام میں نہ پاپائیت ہے نہ رُوحانی پیشوائیت۔ وقت آگیا ہے کہ یہ خود ساختہ پیشوائیت ڈھا دی جائے تاکہ اللہ کے بندوں کا تعلق اللہ کے دین سے براہِ راست ہو جائے۔

مکتبہ مرکزی انجمن کے نئے فون نمبر: ۱۱ ۲۶ ۸۵
مکتبہ تنظیم اسلامی کے نئے فون نمبر: ۸۳ ۲۶ ۸۵

(بقیہ) تذکرہ تبصرہ

کی جانب منتقل ہوا، وہ اس طرح کہ راقم امام بیہقیؒ کی شعب الایمان میں وارد شدہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بیان کر رہا تھا جو حضرت علیؓ سے مروی ہے اور جس میں عظمتِ قرآن کا بیان نہایت تفصیل سے ہوا ہے - یہ حدیث پہلے بھی بارہا پڑھی اور پڑھائی تھی لیکن اس دفعہ اچانک محسوس ہوا کہ اس میں خود راقم کے لئے ایک عظیم بشارت موجود تھی اس لئے اس کا اختتام ہوا ہے ان الفاظِ مبارکہ پر کہ "وَمَنْ دَعَیٰ اِلَیْہِ فَقَدْ ھُدِیَ اِلیٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" یعنی "جو کوئی اس (قرآن) کی طرف دعوت دیتا ہے (کسی اور کو اس سے کوئی فائدہ پہنچے یا نہ پہنچے) خود اسے صراطِ مستقیم کی ہدایت بہرحال نصیب ہو گئی!"

——— ع "یہ نصیب" اللہ اکبر، لوٹنے کی جائے ہے!"

اس سال بھی عید کے دوسرے دن ایسا ہی واقعہ پیش آیا - راقم کی طبیعت کچھ مضمحل سی تھی لہٰذا ناشتے کے بعد ذرا لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی - تھوڑی دیر بعد کسی بچے نے جگایا کہ برادرم قمر سعید قریشی صاحب ملنے کے لئے آئے ہیں تو احساس ہوا کہ راقم ایک خواب دیکھ رہا تھا کہ وہ کسی اجتماع میں درسِ قرآن دے رہا ہے اور آیت وہ ہے جو "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ" کے الفاظ سے شروع ہوتی ہے اور راقم ابھی "فَرَضَ" کی تشریح ہی کر رہا تھا کہ جاگ گیا، اب ذہن پر کافی زور دیا کہ وہ آیت کونسی ہے تو بالکل یاد نہ آیا - راقم نے قرآن حکیم کے جن مقامات کا درس بتکرار و اعادہ دیا ہے وہ راقم کے مرتبہ "منتخب نصاب" سے متعلق ہیں اور ان میں یہ آیت موجود نہیں اور مسلسل درس کے سلسلہ میں راقم ابھی سورۃ الفرقان تک پہنچا ہے اور وہاں تک بھی یہ آیت نہیں آئی - لہٰذا راقم نے زندگی بھر کبھی اس آیت کا درس نہیں دیا - الغرض راقم اسی شش و پنج کو دل میں لئے ہوئے باہر آیا اور برادرم قمر سعید صاحب سے بھی اس کا ذکر کیا - اور پھر عزیزم عاکف سعید سلمہٗ سے پوچھا کہ یہ آیت کونسی ہے اور انہوں نے پوری آیت "اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلیٰ مَعَادٍ" سنائی تو نہایت مسرت ہوئی اور انشراح حاصل ہوا کہ یہ بھی درحقیقت ایک عظیم بشارت ہے،

الغرض معاملہ وہی ہے کہ ع "اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں — کبھی سوز و سازِ رومی، کبھی پیچ و تابِ رازی" کبھی قبض کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو کبھی بسط بھی حاصل ہوتا ہے، کبھی اپنے آپ سے شدید مایوسی بھی ہو جاتی ہے تو کبھی اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات کے حوالے سے امید و رجاء کی کیفیت بھی بھرپور طور پر میسر آ جاتی ہے، چنانچہ حالیہ مخالفت اور اسکی شدت و حدت سے تشویش بھی یقیناً لاحق ہوئی لیکن پھر اسی کے پردے میں عظیم بشارتوں کا مشاہدہ بھی ہوا - اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ فتنوں سے اپنی حفاظت رکھے - اور جس خدمت کی توفیق خالصتاً اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائی ہے اس کے لئے تادمِ مرگ قبول کئے رکھے ع "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!" اور ع "منت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی — منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت!"

مخالفت کے مندرجہ بالا تذکرے میں راقم نے مولانا امین احسن اصلاحی کے ذکر کو جان بوجھ کر علیٰحدہ رکھا ہے - اِس لئے کہ ان کا معاملہ اس اعتبار سے بالکل منفرد ہے کہ ایک پہلو سے تو ان کی مخالفت کی سرے سے کوئی اہمیت ہی نہیں ہے اور ایک دوسرے پہلو سے ان کی مخالفت اہم ترین ہے۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ عمومی اور مجموعی اعتبار سے مولانا

موصوف کسی اہم حیثیت کے حامل نہیں ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اُن کے 'شاہکار خط' کو
تھانوی حضرات اپنے وسیع و عریض نظام کے ذریعے نہ پھیلاتے تو سوائے معدودے چند لوگوں
کے کسی کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ مولانا اصلاحی کون ہیں اور اُن کی رائے کیا ہے' لیکن خود تمام
کے محدود سے حلقے میں مولانا موصوف خود بھی بدرجۂ اتم معروف ہیں اور اُن کی علمی حیثیت و
وجاہت بھی مُسلّم ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے اُن کی مخالفت ایسی نہیں ہے' جسے بالکل نظرانداز
کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ انجمن خُدّام القرآن کے کارکنان اور تنظیم اسلامی کے رُفقاء کی
ایک بڑی تعداد مُصر رہی کہ اُن کے الزامات کا جواب تفصیلاً دیا جائے۔ اِدھر قارئینِ میثاق کی
اکثریت کا تأثر یہ سامنے آیا کہ انہیں 'میثاق' کے صفحات کا اس ردّ و قدح کی نذر ہونا
پسند نہیں ہے۔ الغرض یہ بھی ایک مخمصہ تھا جس میں راقم ان دنوں گرفتار رہا۔ اس ضمن
میں اپنی حد تک راقم نے تو یہی فیصلہ کیا کہ نہ وہ خود اس پر وقت ضائع کرے گا نہ 'میثاق'
کے صفحات کو اس قضیّۂ نامرضیّہ سے آلودہ ہونے دے گا۔ البتّہ تنظیمی ضرورتوں کو ملحوظ
رکھتے ہوئے محترم شیخ جمیل الرّحمٰن صاحب نے ایک مفصّل تحریر لکھی ہے، جسے وہ اپنے ہی
طور پر شائع کر رہے ہیں۔ وہ اب کراچی ہی میں زیرِ طبع ہے اور راقم کی نظر سے بھی وہ طباعت
کے بعد ہی گذرے گی۔ اُنہوں نے اپنے احساسات وجذبات کی رعایت سے اِس کا نام
"خوُن کے آنسو" تجویز کیا تھا۔ لیکن بعض احباب کے مشورے سے اب بدل کر "اظہارِ حقیقت"
کر دیا ہے۔ جن حضرات کو اس بحث سے دلچسپی ہو وہ اُن ہی سے "۲۴-جاپان مینشن ع۲
ریگل چوک، پریڈی اسٹریٹ' صدر، کراچی" کے پتے پر رابطہ قائم فرمائیں!

'میثاق' کا یہ شمارہ دو اشاعتوں کے قائم مقام ہے، اور اُس میں بھی عام شماروں
کی نسبت آٹھ صفحات کم ہیں۔ 'میثاق' کا آئندہ شمارہ بھی دو اشاعتوں ہی کے قائم مقام
ہوگا، جو اِن شاء اللّٰہ دسمبر کے اوائل میں ہدیۂ ناظرین کر دیا جائے گا۔ اور اس میں
مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام جو پانچویں سالانہ قرآن کانفرنس اس سال
ماہ مارچ میں منعقد ہوئی تھی، اُس کے مقالات یکجا شائع کر دیئے جائیں گے۔ یہ شمارہ
کم از کم دو صد صفحات پر مشتمل ہوگا، اور مستقل خریداروں کو اُن کے سالانہ زرِ اعانت ہی کے حساب
میں ارسال کیا جائے گا۔ اور اس طرح گذشتہ تمام کمیوں کی تلافی ہو جائے گی۔ (ادارہ)

Regd. L. No.
Monthly MEESAQ Lahore
Volm. 27 | SEP., OCT. 1978 | No. 9-10

لیحق الحق و یبطل الباطل

ڈاکٹر اسرار احمد

پر مولانا امین احسن اصلاحی اور ان کے شاگرد رشید کے الزامات کا

تحقیقی تجزیہ

اظہار حقیقت

تالیف

شیخ جمیل الرحمٰن

مع

"ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کی حالیہ مخالفت"

از قلم ــــــ مولانا وصی مظہر ندوی ــــــ حیدر آباد

۱۸X۲۲/۸ کے ۱۶۰ صفحات ، سفید کاغذ پر آفسٹ کی طباعت

قیمت فی نسخہ : -/۴ روپے

ملنے کے پتے

۱۔ جمیل الرحمٰن ، ۴۲ ۔ جاپان مینشن نمبر ۲ ، پریڈی اسٹریٹ ، صدر۔ کراچی

۲۔ خلیل سپر اسٹورز ، حکیم جی اسٹریٹ ، نزد فریر مارکیٹ ، کراچی

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے باہتمام چوھدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح سے چھپوا کر مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی ،